allurdupdfnovels.blogspot.com

فلم "گائیڈ" 1965ء

فلم "ہم دونوں" 1961ء

فلم "ہرے رامہرے کرشنا" 1971ء

وہ آیا اور چھا گیا طوفان کی مانند
دیو آنند

قسط:01

دنیا مجھے دیو آنند کے نام سے جانتی ہے۔ آج میں اپنی آپ بیتی، سرگزشت یا سوانح حیات لکھنے بیٹھا ہوں تو یادوں اور واقعات کا ایک سیلاب ذہن میں امنڈ آیا ہے۔ ماضی کی اَن گنت تصویریں ہیں جو ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی زیادہ سے زیادہ آگے آنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ خودنوشت ترتیب دینا یا اپنی آپ بیتی خود لکھنا بہت آسان بھی ہوسکتا ہے اور بہت مشکل بھی۔

آسان اس لیے کہ اس میں فرضی داستان یا افسانے کی طرح آپ کو کردار تخلیق نہیں کرنے پڑتے، واقعات گھڑنے نہیں پڑتے۔ سب کچھ آپ کی زندگی میں موجود ہوتا ہے۔ واقعات پیش آچکے ہوتے ہیں۔ کردار آپ کے اردگرد موجود ہوتے ہیں یا ان کی تصویریں آپ کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہیں۔ آپ کو صرف یادوں کے دریچے کھول کر سارا احوال لکھنا ہوتا ہے لیکن یہ کام مشکل اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ خود اپنے بارے میں اور اپنے من چاہے لوگوں کے بارے میں انصاف، دیانتداری اور تمامتر سچائی کے ساتھ لکھنا ایک کڑا امتحان ہوتا ہے۔ حقائق بعض اوقات تلخ اور ناخوشگوار بھی ہوتے ہیں۔ اپنی خوبیوں، خامیوں کو دیانتداری اور غیر جانبداری سے دوسروں کے سامنے لانا، اپنا دل کھول کر دوسروں کے سامنے رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔

خاص طور پر جب آپ ایک فلمی ہیرو ہوں، ساٹھ سال تک آپ نے فلم کے پردے پر اپنے آپ کو نہ جانے کس کس روپ بہروپ میں پیش کیا ہو، آپ کے اَن گنت چاہنے والے اور آپ کو پسند کرنے والے دنیا کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہوں اور ان سب نے اپنے اپنے ذہن میں آپ کا نہ جانے کیا امیج بنا رکھا ہو۔ اس کے باوجود آپ صرف اپنی تعریفیں ہی تعریفیں تو نہیں لکھ سکتے۔ اپنی سوانح عمری میں بھی اپنے آپ کو صرف فلمی ہیرو بنا کر تو پیش نہیں کرسکتے۔ اپنی آپ بیتی میں تو آپ کو اپنا اصل، اپنی وہ شخصیت سامنے لانی ہوتی ہے جو اس فلمی ہیرو کے پیچھے چھپی ہوئی ہے اور ایک فلم بین یا عام آدمی کی نظر سے اوجھل ہے۔ آپ کو اپنے اور دوسروں کے بارے میں سچ لکھنا ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے بارے میں سچ لکھنے کا حوصلہ کر بھی لیں، تب بھی دوسروں کے بارے میں لکھا ہوا سچ انہیں ناگوار گزر سکتا ہے۔ یوں آپ بیتی لکھنا ایک امتحان سے کم نہیں۔

اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جس شخص نے فلم نگری میں اتنا طویل دور گزارا ہو اور لمبی عمر پائی ہو، اس کیلئے اپنی زندگی کے تمام واقعات کو یاد رکھنا بھی مشکل ہے۔ وقت کے ساتھ بہت سی باتیں یادوں کے اُفق پر دھندلا جاتی ہیں۔ اپنے بارے میں لکھتے وقت یہ دھڑکا بھی لگا رہتا ہے کہ لوگ آپ کو خود پرست یا نرگسیت پسند نہ سمجھ لیں۔ مجھ پر تو ویسے بھی یہ الزام عائد ہوتا رہا ہے کہ میں ایک خود پسند اور خود پرست آدمی ہوں۔

اپنے آپ کو ذرا بہتر بنا کر پیش کرنے کے پیچھے میرا فلسفہ یہ ہے کہ میں شوبز کا آدمی ہوں، بے شمار لوگوں کے ذہن میں میرا امیج ایک دیوتا جیسا ہے۔ وہ مجھ سے تحریک اور انسپائریشن حاصل کرتے ہیں۔ میں اب اپنے آپ کو ان کی نظروں میں گرا کر تو پیش نہیں کرسکتا۔ اگر میں اپنا امیج اچھا رکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اسے میری خود پسندی یا خود پرستی نہیں سمجھنا چاہیے۔ میرا خیال ہے جو لوگ حسد یا رشک کی نظر سے میری طرف دیکھتے ہیں، انہیں میری بعض باتوں پر خود پسندی کا گمان گزرتا ہے۔

میرے ذہن میں بہت سارے لوگوں، بہت سے لمحوں اور بہت سے واقعات کی یادیں یوں موجود ہیں جیسے کسی چیز میں بے شمار ننھے ننھے ہیرے موتی جڑے ہوں۔ ان میں سے کچھ ہیرے موتی وقت کے ساتھ دھندلا گئے ہیں اور کچھ ٹوٹ کر گر گئے ہیں، یعنی میرے ذہن سے محو ہوگئے ہیں لیکن جو بھی باقی ہیں اور یادوں کے اُفق پر جھلملا رہے ہیں، وہ میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں انہیں خوشی اور فخر سے دیکھتا ہوں۔ میری زندگی میں پچھتاوے نہیں ہیں۔ اگر زندگی میں پچھتاوے آئے بھی..... تو میں نے کوشش کی کہ انہیں فراموش کردوں۔

اپنی زندگی کے مکمل سفر اور ہر لمحے کی یاد کو بیان کرنے کے لیے تو مجھے ہزاروں صفحات چاہئیں لیکن چونکہ یہ بوجوہ ممکن نہیں ہے، اس لیے میں نے ہر چیز کو حتی الامکان اختصار سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ مت سمجھیے گا کہ میں نے جن واقعات یا افراد کا تذکرہ اختصار سے کیا ہے، وہ میری زندگی میں اہم نہیں تھے۔ عین ممکن ہے کہ میرے دل میں ان کے لیے ڈھیروں جذبات ہوں۔

اپنی زندگی کی کہانی شروع کرنے سے پہلے میں اپنے تمام مداحوں، پرستاروں اور چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کی محبت اور پسندیدگی نے ہی مجھے دیو آنند بنایا ہے۔ ان میں سے بعض سے میری ملاقات بھی ہوئی، بعض سے فون پر بات ہوئی اور بعض کے خطوط کے میں نے جواب دیئے۔ اپنے ساٹھ سالہ کیریئر کے دوران اپنے نام آنے والے خطوط کی تعداد دیکھ کر میں ہمیشہ حیران ہوتا رہا ہوں۔ اگر میں ان سب کو جمع کرتا تو مجھے ان کے لیے ایک بڑا سا مکان الگ لینا پڑتا۔ میں نے الگ مکان لینے کے بجائے انہیں اپنے دل میں محفوظ کرلیا۔

میں نے اپنے ایک پرستار کے خط کا جواب دیا تو اس نے امید پر مجھے 3720 مزید خط لکھ ڈالے کہ شاید میں ایک بار پھر اسے خط لکھ دوں۔ میں اگر کسی پرستار کے خط کا جواب دیتا تھا تو خود دیتا تھا۔ اس کام کے لیے میں نے کوئی سیکرٹری نہیں رکھا تھا کیونکہ سیکرٹری سے لکھوائے ہوئے جواب کے ذریعے پرستار سے آپ کا ذاتی ناتا نہیں جڑتا۔ میں جواب اگر لکھتا تھا تو خود لکھتا تھا ورنہ جواب دیتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار میں نے ایک نوجوان لڑکی کے انتہائی جذباتی خطوط کے جواب میں دس بارہ خط لکھ دیئے اور اس کے بعد یہ سلسلہ بند کردیا۔ تب اس لڑکی نے اپنے ایک نہایت درد بھرے خط کے ساتھ میرے تمام خطوط واپس بھیج دیئے۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور اس نے اپنی دانست میں میری "محبت کی نشانیاں" واپس کردی تھیں۔

میرا دل تو یہی چاہتا تھا کہ میں اپنے ہر پرستار کے ہر خط کا جواب دوں لیکن ظاہر ہے، یہ ممکن نہیں تھا۔ بہرحال..... میں اپنی آپ بیتی کے ذریعے گویا ان سب سے مخاطب ہوں اور ان سے اپنے دل کی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے کس حد تک جانتے ہیں لیکن امید ہے کہ میری سرگزشت پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہتر طور پر جاننے لگیں گے۔

میں نے ساٹھ سال تک اسی جوش و جذبے سے فلمی دنیا میں کام کیا جس جوش و جذبے سے اپنی پہلی فلم میں کام کیا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ میرا جوش و جذبہ دھیما نہیں پڑا۔ پیدائش کے وقت میرا نام "دیو دھرم" رکھا گیا تھا۔ تاہم میرے والد مجھے "دیو..... آن" کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ لفظ "آن" کو بہت لمبا کردیتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ انہیں مجھ کو اس طرح پکارنے میں لطف آتا ہے۔ سرسری طور پر سننے والے کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے "دیوان" کہہ کر آواز دے رہے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا میں بعض جگہ میرا اصل نام "دیودت" درج ہے جو درست نہیں ہے۔ میں نے کئی بار متعلقہ لوگوں کی توجہ اس طرف دلائی لیکن کسی نے اس غلطی کو درست نہیں کیا۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں قریبی دوست مجھے "ڈی ڈی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تھا خود ہی اپنے نام میں ترمیم کرکے اسے "دیو آنند" بنالیا۔ "آنند" میرا خاندانی نام..... یا یوں کہیے کہ میرا "سرنیم" تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس وقت بھی یہ خیال موجود تھا کہ اگر میں کبھی مشہور ہوا تو میری شہرت کے ذریعے میرے خاندان کا نام بھی روشن ہوگا۔ "دیو آنند" کا مطلب ہے "خوشی کا دیوتا"۔

جب میں ذرا مشہور اور فلم کے میدان میں کامیاب ہوا تو لوگوں نے زیادہ تر مجھے "دیو صاحب" کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا۔ مجھے پتا چلا کہ میری غیر موجودگی میں بھی زیادہ تر مجھے اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ شاید لوگ اس لیے بھی ذرا احترام سے میرا نام لینے لگے تھے کہ میں نے نوجوانی میں ہی اپنی فلم کمپنی بھی قائم کرلی تھی۔ یوں میں خود اپنا اور چند دوسرے لوگوں کا باس بن گیا تھا۔ شاید اس لیے میرا نام ذرا احترام سے لیا جانے لگا تھا۔

ممکن ہے میرے نام کے ساتھ "صاحب" کا لاحقہ لگنے کی ایک وجہ یہ ہو کہ میں ذرا ماڈرن، شہری بابو..... یا یوں کہیے کہ مغرب زدہ سا لگتا تھا۔ میں اس زمانے میں بھی ماڈرن لباس پہنتا تھا۔ جینز، جیکٹ وغیرہ میں نظر آتا تھا۔ میں فلمیں بھی ذرا ماڈرن انداز کی بناتا تھا۔ اس طرح کے لوگوں کے ساتھ بھی، اس زمانے میں خاص طور پر "صاحب" کا لاحقہ لگا دیا جاتا تھا۔ میں انگریزی بھی خاصی روانی سے بول لیتا تھا۔ چنانچہ نوجوانی کے زمانے سے ہی میں "دیو صاحب" ہوگیا۔ تاہم قریبی احباب اور بے تکلف دوستوں کے لیے میں "دیو" ہی تھا۔

مجھے ابھی ابھی خیال آیا کہ میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ آخر میں نے یہ کتاب..... اپنی یہ خودنوشت سوانح حیات ترتیب دینے کا ارادہ کب کیا۔ وہ 23 مارچ 2003ء کی رات تھی۔ میں امریکا کے شہر نیویارک کے علاقے مین ہٹن کے سب سے شاندار اور مہنگے ہوٹل "والڈروف ایسٹوریا" کے مین دروازے سے اس کی لابی کی طرف بڑھا۔ راستے میں خوبصورت دکانیں تھیں جن کے شوکیس روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ ان میں کتابوں کی ایک دکان بھی تھی جس میں اپنے وقت کے بہت بڑے اور شہرۂ آفاق مصنفوں ارنسٹ ہیمنگوے، جیمس جوائس، آئن رینڈ، ٹامس ہارڈی، چارلس ڈکنز وغیرہ کی کتابیں خوبصورتی سے سجی ہوئی تھیں۔

لابی کے وسط میں ایک دیوار پر انیسویں صدی کا ایک کلاک لگا ہوا تھا جس کے ڈائل سے ملکہ وکٹوریا کی تصویر گویا نیچے جھانک رہی تھی۔ نیچے متعدد پرانے امریکی صدور کے مجسمے اِستادہ تھے۔ مجسمۂ آزادی کی نقل بھی موجود تھی۔ میں لابی میں داخل ہوا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے وقت یک لخت وہیں رک گیا ہو۔ لابی میں لگے ہوئے ٹی وی سیٹوں پر بغداد پر امریکی حملے کی خبریں اور مناظر چل رہے تھے۔ گولے پھٹ رہے تھے۔ عورتیں، بچے اور مرد مارے جارہے تھے۔ انسانی جسموں کے پرخچے اُڑ رہے تھے۔ خون بہہ رہا تھا۔ عمارتیں ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

میرے قدم اپنی جگہ تھم گئے۔ میں نے قدم اٹھانا چاہا تو میرے پاؤں گویا منوں وزنی ہوگئے۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ نہایت خوش حال اور خوبرو دکھائی دینے والے مرد بے حد خوبصورت عورتوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے چہروں پر بھی تناؤ آگیا تھا اور وہ چلتے چلتے ٹھٹھک سے گئے تھے۔ میرے ذہن میں سوچوں کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا۔ مجھے خیال آیا کہ انسان شاید ازل سے ہی ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ ہمیشہ سے ایک دوسرے کو مارتا آرہا ہے۔ مجھے تقسیم ہند، بنگلا دیش کا قیام، ویت نام کی جنگ..... اور نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا۔ کبھی کسی وجہ سے اور کبھی کسی وجہ سے انسان کا دل رحم سے خالی ہوجاتا ہے۔ وہ درندے سے بدتر ہوجاتا ہے۔ انسان، انسان کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے کہ انسانیت شرم سے منہ چھپا کر نہ جانے کس طرف کو نکل جاتی ہے۔

تب مجھے یہ بھی خیال آیا کہ انسان کتنا کمزور، کیسا فانی اور کیسا معمولی ہے۔ اس دنیا میں ہر لمحے ہزاروں انسان جنگوں، باہمی جھگڑوں، بیماریوں اور حادثات کے باعث موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ فطری موت بھی مرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا نام بھی ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ نامی گرامی اور مشہور لوگوں کو بھی لوگ آخرکار کبھی نہ کبھی بھول ہی جاتے ہیں۔ میں ویسے تو ایک فلم اسٹار ہوں۔ میری فلموں کی صورت میں میری حرکات و سکنات اور میری زندگی کے بے شمار لمحے محفوظ ہوجائیں گے لیکن وہ میرے فلمی روپ ہوں گے۔ میری نقلی زندگی ہوگی۔ میں اصل میں کون ہوں، کیا ہوں، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔

مجھے دنیا میں کوئی ایسی نشانی چھوڑ جانی چاہیے جس کی وجہ سے لوگ کافی عرصے تک مجھے یاد بھی کرتے رہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہوجائے کہ دیو آنند اصل میں کون تھا۔ چنانچہ اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی آپ بیتی، سرگزشت یا سوانح حیات لکھوں گا اور تمامتر دیانتداری کے ساتھ اپنی اصل تصویر لوگوں کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ کتاب لکھنے کا آئیڈیا یوں بھی میرے دل کو بھایا کہ میں نے سنا ہے، کتابیں برسوں تک..... بلکہ شاید صدیوں تک زندہ رہتی ہیں۔ (جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

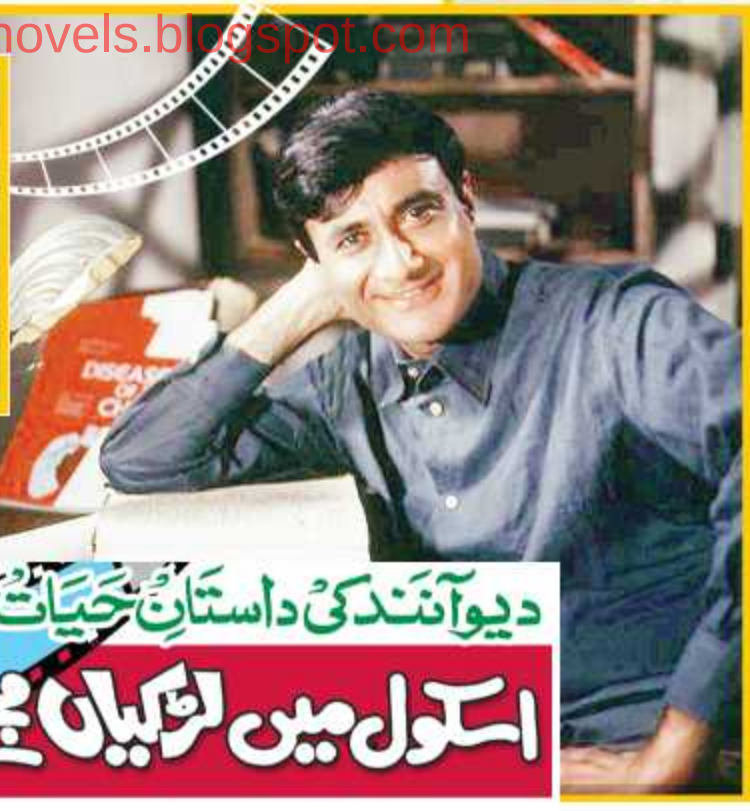

دیو آنند کی داستانِ حیات

اسکول میں لڑکیاں مجھے چھیڑتی تھیں

قسط:02

میرے والد پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کے شہر گورداسپور میں رہتے تھے اور ان کا شمار وہاں کے ممتاز وکلاء میں ہوتا تھا۔ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ پنجاب کی بھی تقسیم ہوئی تو یہ شہر انڈین پنجاب کا حصہ بنا۔ تاہم میں اپنی داستانِ حیات کا آغاز تقسیم سے پہلے کے زمانے سے کر رہا ہوں۔ میں نے انگلش آنرز کے ساتھ بیچلر آف آرٹس کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے لی جو اس زمانے میں بھی نہایت اعلیٰ درجے کا کالج سمجھا جاتا تھا۔ یہاں سے پڑھنے والے زیادہ تر طلباء اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلینڈ کا رخ کرتے تھے۔ ولایت کی ڈگریاں لینے کے بعد ان کی عزت اور بڑھ جاتی تھی۔ انہیں آسانی سے اعلیٰ درجے کی ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ وہ عموماً انڈیا کے ''صاحب لوگ'' بنتے تھے۔

میں بھی یہی خواب دیکھا کرتا تھا لیکن میری قسمت میں یہ نہیں لکھا تھا۔ میں نے جب بی اے کیا، اس وقت تک میرے والد کے مالی حالات اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ایک کٹھن دور سے گزر رہے تھے اور اپنے تیسرے بیٹے کو..... یعنی مجھے..... اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلینڈ بھیجنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے انڈین رائل نیوی میں کمیشن کے لیے درخواست دی جو اس زمانے میں برٹش آرمڈ فورسز کا ایک حصہ تھی۔ مجھے نیوی میں کمیشن نہیں مل سکا تو میرے والد نے مجھے ایک بینک میں کلرکی کرنے کا مشورہ دیا۔

مجھے ان کے اس مشورے سے سخت صدمہ پہنچا۔ یہ گویا میرے خوابوں اور میرے ارمانوں کی توہین تھی۔ میں نے اس روز تنہائی میں باقاعدہ آنسو بہائے۔ میری تمناؤں کی کلیاں گویا کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھیں۔ چند دن غمزدہ رہنے کے بعد اچانک میرے اندر ایک قسم کی بغاوت نے سر ابھارا۔ میں نے سوچا کہ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ مجھے خود کرنا ہوگا۔ میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ میری جیب میں کُل تیس روپے تھے۔

اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے کیا کیا۔ مجھے بس یہ یاد ہے کہ جب میرے حواس نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا تو میں نے اپنے آپ کو فرنٹیئر میل کے ایک تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں مسافروں کی بھیڑ بھاڑ کے درمیان پایا۔ میری جیب میں وہی تیس روپے تھے اور چھوٹا سا ایک بیگ میرے پاس تھا جس میں میرے کچھ کپڑے اور چھوٹا موٹا ضروری سامان تھا۔ مجھے چوبیس گھنٹے سفر کر کے اپنے خوابوں کے شہر ''ممبئی'' جانا تھا۔

ٹرین کھٹا کھٹ آگے کی طرف بھاگ رہی تھی لیکن میرا ذہن پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بیتے دنوں کی یادیں قطار در قطار میری نظروں کے سامنے چلی آ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک نوخیز اور نوجوان لڑکی پلیٹ فارم پر دوڑی چلی آ رہی تھی۔ وہ ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا ہوا تھا۔ اس کی ساڑھی ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی اور اس کے بال پیچھے کی طرف لہرا رہے تھے۔

وہ میری طرف دیکھ کر پکار رہی تھی ''میرا ہاتھ پکڑ لو..... مجھے بھی ساتھ لے لو..... میں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں.....''

میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ شاید اس لیے کہ میں بزدل تھا۔ وہ ٹرین سے پیچھے..... بہت پیچھے رہ گئی۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز، اس کا وجود، سب کچھ معدوم ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لڑکی پلیٹ فارم پر موجود نہیں تھی۔ وہ منظر صرف میرے تخیل کی پیداوار تھا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی دنیا میں کہیں موجود ہی نہیں تھی۔ اس کا خوبصورت وجود اس دنیا کا ایک حصہ تھا اور اس کے دل کے کسی گوشے میں شاید یہ خواہش بھی موجود تھی کہ میں جہاں بھی جاتا، اسے اپنے ساتھ لے جاتا..... لیکن افسوس، کہ میں ایسا نہیں کر سکا کیونکہ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے تو ابھی خود اپنے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ مجھے کن حالات کا سامنا کرنا تھا۔ میں ایک بھاری ذمے داری کیسے اٹھا سکتا تھا؟

اس لڑکی کا نام اوشا چوپڑا تھا اور وہ میری کلاس فیلو تھی۔ اس کی ماں انگریز اور باپ ہندوستانی تھا۔ وہ انگلش ڈپارٹمنٹ میں واحد لڑکی تھی۔ اس شعبے کے سربراہ خود کالج کے پرنسپل مسٹر ڈکنسن تھے۔ اوشا مجھ سے اگلی بینچ پر، عین میرے سامنے بیٹھتی تھی اور سب سے پہلے آ کر اپنی یہ جگہ سنبھال لیتی تھی۔ کلاس ختم ہونے پر وہ سب سے آخر میں نکلتی، کیونکہ اسے ہمیشہ پروفیسر صاحب سے کچھ نہ کچھ پوچھنا ہوتا تھا۔

وہ ہمیشہ ساڑھی میں ہوتی جو اس کے سڈول، مرمریں جسم کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی۔ وہ سرو قد تھی لیکن اونچی ہیل کی جوتیاں پہنتی، جن کی وجہ سے دراز قد دکھائی دیتی۔ میں دل ہی دل میں اس کی محبت میں بری طرح گرفتار تھا لیکن میں چونکہ ایک شرمیلا لڑکا تھا، اس لیے اس سے کچھ کہنے اور اپنے دل کا حال بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میری اس سے زیادہ سے زیادہ بات چیت بس یہ ہوتی تھی کہ میں نہایت دھیمی اور منمناتی سی آواز میں اسے ''ہیلو'' کہہ دیتا تھا۔

میرے والد میرے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میں شرمیلی لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلا تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے گورداسپور میں مجھے ایک ایسے اسکول میں داخل کرایا تھا جہاں لڑکیوں کی اکثریت تھی اور لڑکے برائے نام تھے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے، وہاں لڑکیاں مجھے چھیڑتی تھیں اور اتنا تنگ کرتی تھیں کہ میں روہانسا ہو جاتا تھا۔ مجھے ان سے جان بچا کر اِدھر اُدھر بھاگنا اور چھپنا پڑتا تھا۔ میں ان سے جتنا زیادہ شرماتا تھا، شاید وہ اتنا ہی زیادہ لطف اندوز ہوتی تھیں۔

ان میں سے ایک، کرسچین لڑکی فلورنس تو خاص طور پر، ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ رہتی بھی ہمارے گھر کے قریب ہی تھی۔ اتوار کو بھی میں اسے اپنے گھر کے پیچھے واقع چرچ میں آتے جاتے دیکھتا۔ وہ اکثر میرا پیچھا کرتی تھی اور میں یوں بھاگتا تھا جس طرح فلموں میں ہیروئن، ولن سے عزت بچانے کے لیے بھاگتی ہے۔ میں شام کو، اپنے گھر کے قریب واقع میونسپل پارک میں چہل قدمی کرنے جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ وہاں بھی آ جاتی اور مجھے چہل قدمی کے بجائے دوڑ لگانا پڑتی۔

ایک بار وہ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کی ایک کلی تھی جو اس نے ڈرامائی انداز میں مجھے پیش کی اور اس کے ساتھ ہی مجھے پکڑ کر چوم لیا۔ اس کا یہ ''حملہ'' اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میں دوڑ بھی نہ لگا سکا۔ مجھے اپنے گال اور کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا ہوگا۔ فلورنس میری حالت دیکھ کر ہنس ہنس کر دُہری ہوئی جا رہی تھی۔

میرا یہی شرمیلا پن میرے اور اوشا چوپڑا کے درمیان حائل تھا۔ میں اسے کلاس روم میں، کالج کی راہداریوں میں، اِدھر اُدھر آتے جاتے، دور دور سے دیکھتا۔ میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا، اس کی طلب میں میری حالت عجیب ہو جاتی۔ رات کو گھر میں کھانا کھاتے ہوئے اور بستر پر لیٹنے کے بعد میں گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتا۔ اسے حاصل کرنے کی خواہش اتنی شدت اختیار کرتی کہ میرے اعصاب چٹخنے لگتے اور جب یہ احساس ہوتا کہ کم از کم فی الحال میں اسے نہیں پا سکتا..... تو میرا دل شدت غم سے پھٹنے لگتا..... لیکن اوشا کے سامنے پہنچ کر میرا وہی حال رہتا کہ منہ سے ایک منمناتی ہوئی سی ''ہیلو'' کے سوا کچھ نہ نکلتا۔

میں اس سے بات کرنے، اسے حالِ دل سنانے اور پھر اسے اپنی بانہوں میں بھر لینے کے جو منصوبے خیالوں ہی خیالوں میں بناتا رہتا تھا، وہ سب دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ میری اس سے پہلی بار تھوڑی بہت بات چیت اس وقت ہوئی جب میں نے اسے آخری بار دیکھا۔ اس روز میں کالج کے پرنسپل مسٹر ڈکنسن سے اپنا کیریکٹر سرٹیفکیٹ لینے کے بعد ان کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ اس دن کے بعد مجھے کالج نہیں آنا تھا۔ میں لاہور کو خیرباد کہہ کر جا رہا تھا۔

وہ راہداری میں کھڑی تھی۔ کتابیں اور نوٹ بکس اس کے بازو کے حلقے میں تھیں۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی مخصوص، روشن مسکراہٹ کے ساتھ، مترنم آواز میں گرمجوشی سے مجھے ''ہیلو'' کہا۔ جواب میں میرے حلق سے وہی منمناتی سی ''ہیلو'' برآمد ہوئی۔

''کیا تم ماسٹرز کرنے کے لیے کالج واپس آؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''مم..... معلوم..... نہیں.....'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''آ جانا۔'' اس کے لہجے میں ایک خفیف سی التجا تھی۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مجھے تم ہمیشہ اچھے لگے ہو۔''

''کیا واقعی.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''تم ایم۔ اے کرنے کے لیے واپس ضرور آنا۔ شاید تب تم وہ کہہ سکو جو آج تک نہیں کہہ سکے۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی اُداسی تھی۔ عین اسی وقت پرنسپل اپنے آفس سے نکل آئے اور وہ آگے بڑھ گئی۔ میں بُت بنا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ پرنسپل صاحب نے میرے قریب سے گزرتے وقت مشکوک سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

مجھے بھی بادلِ ناخواستہ آگے بڑھنا پڑا۔ اوشا کہیں غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا ''میں تم سے جو کچھ بھی کہنا چاہتا تھا، وہ شاید کبھی نہ کہہ سکوں..... کیونکہ میرا دل کہہ رہا ہے، آج کے بعد میں کبھی اس کالج میں نہیں آؤں گا۔ یہ شاید میری تقدیر میں لکھا گیا ہے.....''

اس رات اپنے گھر میں منہ دھونے کے لیے چہرے پر پانی کے چھپکے مارنے کے بعد میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ پہلی بار میں نے تنقیدی نظر سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ پانی کے قطرے ابھی شبنم کے موتیوں کی طرح میرے چہرے پر پھسل رہے تھے۔

''شکل تو بُری نہیں ہے.....'' میں نے دل ہی دل میں اپنی صورت پر تبصرہ کیا۔ ''شاید اسی لیے میں اوشا کو اچھا لگتا تھا.....''

تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنا یہ چہرہ ساری دنیا کو دکھاؤں گا۔ شاید لوگ اسے پسند کریں۔ میں اداکار بنوں گا..... نہیں..... اداکار نہیں..... بلکہ میں اسٹار بنوں گا..... فلم اسٹار..... میں بمبئی جاؤں گا۔ شوبز کی دنیا میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں نے اپنے آپ سے یہ سب کچھ کہا تو مجھے ایک عجیب سی طمانیت اور بے پناہ خوشی کا احساس ہوا۔ میں نے گویا اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے اہم فیصلہ کر لیا تھا۔ اس خوشی میں، میں نے ایک قہقہہ لگایا اور آئینے کے سامنے تھوڑا سا ڈانس بھی کیا۔

ٹرین جب بمبئی کی طرف رواں تھی، تب بھی انہی لمحات کو یاد کرتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ لوگ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں مناظر تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ آنکھوں سے میں ان مناظر کو دیکھ رہا تھا لیکن میرے ذہن کے پردے پر دوسرے مناظر اُبھر رہے تھے۔ وہ میری یادیں تھیں، اَن گنت یادیں۔ ذہن کے افق پر کبھی کوئی منظر اُبھرتا، کبھی کوئی دوسرا منظر اس کی جگہ لے لیتا۔

مجھے اپنے والد یاد آئے اور افسوس ہوا کہ میں نے انہیں بھی نہیں بتایا تھا، میں ان سے بہت دور جا رہا ہوں۔ میرے والد بہت قابل آدمی اور بہترین مقرر تھے۔ وہ خود آریہ سماجی تھے لیکن انہیں کئی مذاہب کا بے پناہ علم حاصل تھا۔ وہ تمام مذاہب کی اچھی باتوں کے قائل تھے۔ وہ عیسائیوں اور مسلمانوں سے ان کے مذاہب کے بارے میں گھنٹوں بات کر سکتے تھے۔ انہیں ان کی مذہبی کتابوں کے بہت سے حصے زبانی یاد تھے۔ وہ انہیں ان کے مذاہب کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بتا سکتے تھے جو انہیں خود بھی معلوم نہیں تھیں۔ وہ میرے لیے بہترین استاد اور معلم تھے۔ انہیں فارسی، عربی اور عبرانی آتی تھی۔ وہ یہودیوں کو تورات کی آیات بھی سنا سکتے تھے۔ فارسی کے سیکڑوں اشعار انہیں یاد تھے اور وہ برمحل انہیں استعمال کرتے تھے تو لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے صرف میں ہی ان کی قابلیت اور علمیت کا قائل نہیں تھا، شہر کے وہ سبھی لوگ قائل تھے جو انہیں جانتے تھے۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

DEV ANAND 1923 - 2011

دکاندار نے کہا "تم بڑے آدمی بنو گے"

قسط : 03

میرے والد ایک نہایت فراخدل انسان تھے۔ یوں تو وہ ہر معاملے میں ہی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنے کے عادی تھے لیکن خاص طور پر تعلیم کے سلسلے میں وہ زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے قائل تھے۔ ہم نو بہن بھائی تھے۔ ہمارا سب سے چھوٹا ایک بھائی اور پیدا ہوا تھا لیکن وہ بہت چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر گیا تھا ورنہ ہم دس بہن بھائی ہوتے۔ والد صاحب نے ہم سب بہن بھائیوں کو وقت اور اپنے حالات کی مناسبت سے، اچھی سے اچھی تعلیم دلانے کی کوشش کی۔

میرے سب سے بڑے بھائی نے سنسکرت میں ایم۔اے کیا، پھر والد کے نقش قدم پر چلنے کے لیے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ان سے چھوٹے بھائی کو پڑھنے کے لیے انگلینڈ کی ایک یونیورسٹی میں بھیجا گیا جو پھر مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنے لگا لیکن جب میری اعلیٰ تعلیم کی باری آئی تو والد صاحب کے مالی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ شاید قسمت کو یہ منظور تھا کہ اس بہانے میں ایکٹر بننے کا شوق دل میں لیے ممبئی چلا جاؤں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنی دور چلے جانے کے بعد برسوں میری اپنے والد سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کے دوران دوڑتے بھاگتے مناظر کے درمیان مجھے اپنے خاندان والوں کے چہرے ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے سے گزرتے دکھائی دیئے۔ چشم تصور سے میں نے اپنے والد کا چہرہ دیکھا تو میری آنکھوں میں نمی چھلک آئی اور میری نظر دھندلانے لگی۔ مجھے اپنی دو بڑی بہنوں کے چہرے نظر آئے جو لاہور میں تھیں۔ ان میں ایک ڈاکٹر کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ دوسری کا شوہر وکیل تھا۔ سب سے بڑی بہن دہلی میں بیاہی ہوئی تھی اور وہیں رہائش پذیر تھی۔

میری دو چھوٹی بہنیں گنگا رام اسکول لاہور میں پڑھ رہی تھیں۔ میرے بڑے بھائی یوں تو گورداسپور میں وکالت کرتے تھے لیکن ان دنوں وہ لاہور کی جیل میں تھے۔ وہ گورداسپور میں کانگریس کی ڈسٹرکٹ کمیٹی کے رکن تھے اور گاندھی نے انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کی جو تحریک چلائی ہوئی تھی، اس میں حصہ لیتے ہوئے وہ بھوک ہڑتال کرنے پر گرفتار ہو گئے تھے اور انہیں جیل بھیج دیا گیا تھا۔

میرا چھوٹا بھائی مجھ سے بہت مانوس تھا اور ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ میں ہر جگہ اسے اپنی پیٹھ پر اٹھائے پھرتا تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ، ہاکی، گلی ڈنڈا اور کنچے، سبھی کچھ کھیلتا تھا لیکن سب سے زیادہ شوق مجھے کنچے ہی کھیلنے کا تھا اور میرے پاس شیشے کی ان رنگا رنگ گولیوں کا ایک تھیلا بھرا ہوا تھا۔ میری والدہ کا چہرہ میری دھندلائی ہوئی نظروں کے سامنے ابھرا۔ سردیوں میں وہ مجھے سونے کیلئے لٹاتیں تو کمبل نہایت احتیاط سے میرے گرد لپیٹ کر مجھے سونے کی دعا پڑھواتیں جو اتنی لمبی تھی کہ میں اسے پڑھنے کے دوران ہی سو جاتا۔

میری عمر اس وقت 19 سال تھی جب میں ٹرین میں بیٹھا ممبئی جا رہا تھا اور ان انیس برسوں کے نہ جانے کون کون سے لمحات بے ترتیب انداز میں میرے تصور میں ابھر رہے تھے اور نہ جانے کون کون سے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ پھر ایک دھیمے سے اشتیاق نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ عمر کے انیس برس تو بیت چکے تھے لیکن اب میں ایک نئی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ نہ جانے وہاں کیا کچھ میرا منتظر تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے والد پوری فیملی کو پہاڑی مقام ڈلہوزی لے جایا کرتے تھے اور وہاں ہم ہمیشہ ایک ہی ولا کرائے پر لیتے تھے جو ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا تھا اور روبنسن نامی ایک انگریز کی ملکیت تھا۔ میری والدہ اس ولا کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھ کر سوئیٹر بنتیں اور میں بلندی سے، نیچے کنٹونمنٹ کے علاقے میں فوجیوں کو آتے جاتے یا پریڈ کرتے دیکھتا۔ فوجی خاکی نیکر اور قمیض میں ہوتے۔ نیکر کے نیچے لمبے سیاہ موزے اور پالش سے چمکتے ہوئے ان کے سیاہ جوتے مجھے بڑے اچھے لگتے۔ ایک بار ہم اس ولا میں چھٹیاں گزارنے پہنچے تو اس کے لان کی جھاڑ جھنکاڑ میں سانپ بسیرا کر چکے تھے۔ میں نے اپنے والد کو تھوڑی سی دیر میں ایک ایک کر کے سات سانپ مارتے دیکھا۔ وہ منظر ابھی تک میرے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ہم چھٹیاں گزارنے ڈلہوزی جاتے تھے لیکن مجھے دو ماہ کے لیے وہاں کے "سیکریڈ ہارٹ" اسکول میں داخل کرا دیا جاتا تھا۔ پہاڑی علاقوں کے اسکول عام طور پر گرمیوں میں کھلے ہوتے تھے۔ ان اسکولوں میں سردیوں میں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ ڈلہوزی میں ایک "ٹھنڈی سڑک" اور ایک "گرم سڑک" تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ دونوں سڑکوں پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا نظارہ دیکھنے کا لطف الگ الگ تھا۔ ٹھنڈی سڑک پر کھڑے ہو کر سورج کو غروب ہوتے دیکھ کر خنکی کا احساس ہوتا تھا جبکہ "گرم سڑک" پر کھڑے ہو کر اگر غروب آفتاب کا نظارہ کیا جاتا تو ذرا گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ ڈلہوزی بلاشبہ ایک نہایت خوبصورت اور بے مثال پہاڑی مقام تھا۔

ڈلہوزی کے ساتھ ساتھ گورداسپور کی ان گنت حسین یادیں بھی میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ نہر میں تیراکی، مشین سے نکلتا ہوا گنے کا رس پینا، تازہ بنتا ہوا گرم گرم گڑ کھانا، گھر کے جمے ہوئے دہی سے بنی لسی پینا، جس میں پیڑے بھی ڈالے جاتے تھے۔ ان چیزوں کی لذت کو یاد کرتے ہوئے میرے منہ میں پانی آ گیا۔

انٹر میں نے ایک اور پہاڑی مقام "دھرم شالا" کے کالج سے کیا تھا جس کے پرنسپل مسٹر بارنز نامی ایک نہایت نخریلے اور نک چڑھے انگریز تھے۔ میرے والد نے خاص طور پر ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے اچھی انگریزی پڑھائیں۔ انہوں نے میرے والد کی یہ فرمائش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کے خلاف سیاسی بنیادوں پر کچھ ہڑتالیں ہوئیں تو ان کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ "مسٹر شوق" آ گئے۔ وہ عمدہ سوٹ پہننے اور نہایت شاندار انگریزی بولنے کے ساتھ ساتھ اردو شعر و شاعری میں بھی دخل رکھتے تھے۔

میں نے ابھی لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ نہیں لیا تھا، جب میری والدہ بیمار پڑ گئیں اور بستر سے لگ گئیں۔ میں ان کی سب سے زیادہ خدمت کرتا۔ کسی ڈاکٹر یا حکیم نے کہا تھا کہ انہیں صرف بکری کا دودھ دیا جائے۔ میں خاص طور پر ایک چرواہے سے ان کے لیے بکری کا دودھ لینے جاتا۔ ان کی بعض دوائیں گورداسپور میں نہیں ملتی تھیں۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بس میں بیٹھ کر ان کے لیے دوائیں لینے تیس مل دور امرتسر جاتا۔

ایک مرتبہ شدید گرمی میں ہم دونوں دوست امرتسر میں سکھوں کے مقدس ترین مقام "گولڈن ٹمپل" کے سامنے ایک دکان سے ٹھنڈا شربت پینے رک گئے۔ ہماری قمیصیں پسینے سے بھیگی ہوئی تھیں۔ دکاندار جب مجھے شربت کا گلاس دینے لگا تو اس نے ایک لمحے کے لیے بغور میری پیشانی کی طرف دیکھا پھر پنجابی میں جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا۔ "مجھے تمہاری پیشانی پر سورج چمکتا دکھائی دے رہا ہے۔ تم ضرور ایک بڑے آدمی بنو گے۔"

اپنی تمام تر کم عمری کے باوجود اس کی پیشگوئی پر میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر سوچنے لگا۔ "ایک قصبے میں رہنے والا عام سا لڑکا جس کے والد کے حالات اس وقت اسے پڑھنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور بھیجنے کی اجازت بھی نہیں دے رہے..... بھلا بڑا آدمی کیسے بن سکتا ہے؟"

شام کو جب میں اپنے گھر میں اپنی بیمار والدہ کے پاس ان کی چارپائی پر بیٹھا تھا تو میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا۔ میرے والد جو قریب ہی بیٹھے تھے، منہ بنا کر بولے۔ "تمہیں اس کی باتوں پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعض دکاندار اپنے گاہکوں کا دل بہلانے کیلئے خوامخواہ ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

مگر میری والدہ نے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا بیٹا ضرور بہت بڑا آدمی بنے گا کیونکہ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔"

جب میں چھوٹا تھا تو ایک بار گلی سے ایک جنازہ گزرتے دیکھنے کے بعد میں نے اپنی والدہ سے کہا۔ "اگر کسی روز آپ بھی اسی طرح مجھے چھوڑ کر اوپر والے کے پاس چلی گئیں تو میرا کیا ہوگا؟"

میری والدہ نے مجھے سینے سے لگا لیا تھا اور تسلی دینے کے انداز میں بولی تھیں۔ "میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی..... بھگوان کے پاس بھی نہیں....."

انہوں نے یہ کہا تھا لیکن اب انہیں ٹی بی ہو چکی تھی اور وہ سوکھ کر ڈھانچا ہو گئی تھیں۔ آخر ڈاکٹروں نے انہیں سینی ٹوریم بھجوانے کا مشورہ دیا۔ ہم چار بھائی بالکل چھوٹے تھے اور ہمیں چھوڑ کر جانے کے خیال سے والدہ کا اور بھی برا حال تھا لیکن آخر کار ایک روز ہم نے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ انہیں سینی ٹوریم روانہ کر دیا۔ والد ان کے ساتھ چلے گئے۔

انہیں گئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک روز اچانک دھڑ سے ہمارے گھر کا دروازہ کھلا اور ہمارا ایک پڑوسی دوڑتا ہوا اندر آ گیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر وہ گلوگیر آواز میں چیخا۔ "بچو! تمہاری ماں مر گئی.....!"

پھر میرے ذہن میں وہ منظر ابھرا جب میری والدہ کی چتا کو آگ لگائی جا رہی تھی اور میں اپنی بڑی بہن سے لپٹ کر کہہ رہا تھا۔ "ماتا جی نے تو کہا تھا کہ وہ کبھی مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گی..... بھگوان کے پاس بھی نہیں..... مگر وہ تو چلی گئیں....."

مجھے اپنے گالوں پر آنسوؤں کی نمی کا احساس ہوا۔ میں نے گالوں پر ہاتھ پھیرا تو واقعی وہ آنسوؤں سے تر تھے..... اور اس وقت میں والدہ کی چتا کے پاس نہیں کھڑا تھا بلکہ ٹرین میں بیٹھا ممبئی جا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر جلدی سے منہ کھڑکی کی طرف کر لیا تاکہ دوسرے مسافر میرے آنسو نہ دیکھ سکیں۔ میں دوسروں سے اپنے آنسو چھپا رہا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری کائنات میرے ساتھ رو رہی ہے۔ پھر تیز بارش شروع ہو گئی تو مجھے کھڑکی کا شیشہ بند کرنا پڑا۔

ٹرین آخر کار ممبئی کے سینٹرل اسٹیشن پر جا رکی اور میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر اپنے بڑے بھائی چیتن کی تلاش میں پلیٹ فارم پر نظریں دوڑائیں جسے مجھ کو ریسیو کرنے کے لیے آنا تھا۔ چیتن ممبئی میں رہتا نہیں تھا۔ وہ خود یہاں کے مختصر تفریحی دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہیں انڈین سول سروس کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ فی الحال وہ ڈیرہ دون کے نہایت اعلیٰ درجے کے "دون اسکول" میں پڑھا رہا تھا۔ اس بورڈنگ اسکول میں نہایت اونچے طبقے کے بچے پڑھنے آتے تھے۔

چیتن مجھے پلیٹ فارم پر مل گیا اور میں اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ سے چھوڑے بغیر اس سے گرمجوشی سے بغل گیر ہوا۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ مجھے باہر لے آیا اور بولا۔ "ذرا شاہانہ انداز میں چلتے ہیں۔ وکٹوریہ (بگھی) میں بیٹھتے ہیں۔"

ہم وکٹوریہ میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو میں سر اٹھا کر ممبئی کی بلند اور خوبصورت عمارتوں کو دیکھنے لگا۔ یہ تو واقعی لاہور سے بھی بڑا اور زیادہ شاندار شہر دکھائی دے رہا تھا اور ہمارا گورداسپور تو اس کے سامنے بالکل ہی گاؤں تھا۔ چیتن یقیناً فخر محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے اور قدرے گاؤدی سے بھائی کو ممبئی دکھا رہا تھا۔ میں ممبئی سے بھی مرعوب تھا اور اپنے بھائی سے بھی..... وہ واقعی اعلیٰ تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ نہایت روانی سے خوبصورت انگریزی بولتا تھا۔ اس کا لباس، وضع قطع اور انداز اطوار انگریزوں جیسے تھے۔ میں اس کے پاس ڈیرہ دون چند بار جا چکا تھا جہاں اسے اسکول کی طرف سے ایک اپارٹمنٹ ملا ہوا تھا۔ میرے قیام کے دوران چیتن میری انگریزی کی خامیاں دور کرتا اور مجھے انگریزوں والے اطوار اور آداب سکھانے کی کوشش کرتا۔

اس نے اپنی منگیتر کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے لیے بھی مجھے بھیجا تھا۔ اس کی منگیتر اوما چٹرجی جو بعد میں اس کی بیوی بنی، انگریزی کے ایک نہایت قابل پروفیسر کی بیٹی تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ چیتن میرا آئیڈیل تھا۔ میری ابتدائی فلموں میں میری شخصیت میں میرے اسی بھائی کا رنگ جھلکتا رہا لیکن جب میں اسٹار..... اور پھر سپر اسٹار بن گیا تو میں اس دوران یہ چھاپ اپنے اوپر سے اتار چکا تھا۔ جلد ہی میرا اپنا ایک اسٹائل بن گیا تھا۔

(جاری ہے)

(1)..... ہیما مالنی، دیو آنند فلم "جونی میرا نام" (1970ء)
(2)..... وجنتی مالا کے ساتھ فلم "جیول تھیف" (1967ء)
(3)..... نوتن کے ساتھ فلم "تیرے گھر کے سامنے" (1963ء)

allurdupdfnovels.blogspot.com

وہ روسی لڑکی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی

قسط : 04

وکٹوریہ آخر کار مالا بار ہل کے شاندار رہائشی علاقے میں واکیشو رروڈ پر جا رکی۔ گورنر کی رہائش بھی یہیں تھی۔ میرا بھائی یہاں اپنے کالج کے زمانے کے ایک دوست کے شاندار اپارٹمنٹ میں مقیم تھا۔ وہ دوست اب کسٹم میں ایک بڑا افسر تھا۔ یہ اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا جس کے ایک کمرے میں ماربل کے فرش پر ہمارے لیے فوم کے گدے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں صبح ہماری آنکھ ستار کی دھیمی اور دلکش دھنوں سے کھلتی تھی۔ ستار، سامنے والے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں ایک گوری چٹی خاتون بجاتی تھیں جن کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، ماتھے پر تلک اور مانگ میں سیندور ہوتا تھا۔

مجھے پتا چلا کہ سامنے والے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں روزانہ صبح سویرے ستار بجانے والی گوری چٹی خاتون کسی محکمے میں سیکرٹری ہوا کرتی تھیں اور اب ایک دھانسو قسم کے فلمی صحافی کی بیوی تھیں۔ سامنے اپارٹمنٹ میں رہنے والے یہ صاحب ایک نہایت کامیاب فلمی رسالہ نکالتے تھے جس میں فلمی خبریں، انٹرویوز سبھی کچھ ہوتا تھا۔ یہ رسالہ ماہنامہ تھا۔ میں خود جب گورنمنٹ کالج لاہور میں تھا تو بے چینی سے اس کا انتظار کرتا تھا اور بڑے شوق سے اسے پڑھتا تھا۔

وہ رسالہ صرف پڑھنے والوں میں ہی مقبول نہیں تھا، میں نے سنا تھا کہ فلم انڈسٹری پر بھی اس کا زبردست رعب اور دبدبہ تھا۔ فلم اسٹارز اور ڈائریکٹرز وغیرہ تک اس کے ایڈیٹر سے ڈرتے تھے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کسی کو اسٹار بنانے اور کسی فلم کو کامیاب یا ناکام بنانے میں اس رسالے کی تحریریں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ باتیں تو میں نے پہلے سے سنی ہوئی تھیں لیکن اب جب ہم نے سامنے بالکونی میں ستار بجانے والی خاتون کے بارے میں معلومات کیں تو یہ بھی

نوتن، دیو آنند "پے انگ گیسٹ" میں (1957ء)

فلم "سی آئی ڈی" میں وحیدہ رحمان کے ساتھ (1957ء)

پتا چلا کہ ان کے بارے میں بھی بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ بعض لوگ انہی کو ان کے شوہر کی اصل طاقت سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے شوہر کی تحریروں اور ان کے رسالے کے آئیڈیاز کے پیچھے درحقیقت انہی خاتون کا ہاتھ تھا۔

فلمی دنیا پر اتنا اثر و رسوخ رکھنے والی ایک شخصیت ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی لیکن افسوس، کہ مجھ جیسا نوجوان جو ہیرو بننے کا خواب آنکھوں میں سجائے بمبئی آیا تھا، اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ میرے بھائی یا ہمارے میزبان کی اس سے ذرا سی بھی شناسائی نہیں تھی۔ ہمارے آس پاس فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی صرف وہی ایک شخصیت نہیں تھی۔ مجھے پتا چلا کہ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر مشہور اداکار موتی لال بھی رہتے تھے۔ وہ بلاشبہ اس وقت کے اسٹار تھے۔ ان کے علاوہ انگریزی میں لکھنے والے مشہور ناول نگار راجہ راؤ بھی قریب ہی رہتے تھے۔ ان سے میرے بھائی کی دوستی تھی۔ وہ دونوں اونچے طبقے کے لوگوں کے ایک کلب کے ممبر بھی تھے۔

راجہ راؤ کافی عرصہ فرانس میں بھی رہ چکے تھے اور روانی سے فرانسیسی بولتے تھے۔ وہ نہایت وجیہہ آدمی تھے۔ کلف لگی دھوتی اور کرتا بھی ان کی شخصیت پر خوب جچتا تھا۔ ان کے لمبے بال کندھوں پر جھولتے تھے اور وہ سر کے بیچ میں مانگ نکالتے تھے۔ اونچے طبقے کی خواتین میں وہ بے حد مقبول تھے۔ ان سے میری بھی دوستی ہوگئی اور جب میرے بڑے بھائی واپس اپنے اسکول میں پڑھانے کے لئے ڈیرہ دون چلے گئے تو راجہ راؤ نے مجھے اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دے دی جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ جب تک مجھے اپنی جدوجہد میں کچھ کامیابی نصیب نہ ہو جاتی، تب تک مجھے اس قسم کے ٹھکانے کی ضرورت تو بہرحال تھی۔

موتی لال، راجہ راؤ کے قریب ہی رہتے تھے اور ایک اچھی بات یہ تھی کہ راجہ راؤ کی ان سے شناسائی تھی۔ ایک روز میں حسب معمول راجہ راؤ کے اپارٹمنٹ میں ماربل کے فرش پر سویا ہوا تھا کہ انہوں نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا اور بتایا کہ موتی لال اپنے اپارٹمنٹ سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جانے والے تھے۔ راجہ راؤ اسی دوران راستے میں مجھے ان سے ملوانا چاہتے تھے۔ میری نیند فوراً کافور ہوگئی اور میں اٹھ کر راجہ راؤ کے ساتھ باہر کی طرف لپکا۔

راجہ راؤ نے میرا تعارف موتی لال سے کرایا تو وہ خوش مزاجی سے ملے اور بولے۔

"بمبئی کیسے آنا ہوا نوجوان؟"

"اسی ارادے سے آیا ہوں جس ارادے کے ساتھ آپ دہلی سے یہاں آئے تھے۔" میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

"اچھا..... تو تم اسٹار بننا چاہتے ہو؟" انہوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔

"بالکل آپ کی طرح!" میں نے قدرے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"میری طرح کیوں..... مجھ سے بہتر کیوں نہیں؟" وہ فوراً بولے۔ پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "اپنے حوصلے بلند رکھنا..... تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

وہ ہم سے ہاتھ ملا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیڑھیوں ہی سے وہ اپنے ڈرائیور کو آواز دے کر بلڈنگ کے گیراج سے کار نکالنے کا حکم دے رہے تھے۔ چند لمحے بعد میں نے انہیں ایک کنورٹیبل میں بیٹھ کر میرین ڈرائیو کی شاہراہ پر جاتے دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی گاڑی گویا افق پر غائب ہوگئی۔ انہوں نے میری کوئی رہنمائی نہیں کی تھی، کوئی مشورہ نہیں دیا تھا۔ میری مدد کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بس، خوش خلقی سے مل کر چلے گئے تھے۔ میں رشک سے سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی میں بھی ان کی طرح ایسی کنورٹیبل گاڑی میں بیٹھ کر شوٹنگ پر جا سکوں گا؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ برسوں بعد جب میں اسٹار بن چکا ہوں گا تو فلم "اصلی نقلی" میں وہ میرے ساتھ کیرکٹر رول کر رہے ہوں گے اور میں اس فلم کا ہیرو ہوں گا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے مزید چند برس بعد وہ میرے گھر آئیں گے اور درخواست کریں گے کہ میں ایک فلم سائن کر کے گویا ان کی مدد کروں۔ وہ اس فلم کو ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ وہ اپنے زوال پذیر کیریئر کو ڈائرکشن کے ذریعے سہارا دینا چاہتے تھے۔

افسوس، کہ میں خواہش کے باوجود ان کی اس فلم میں کام کرنے کی ہامی نہ بھر سکا۔ میں واقعی حد سے زیادہ مصروف تھا۔ بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ میں نے جو فلمیں سائن کر رکھی تھیں، ان میں کام کرنا اور اپنے وعدے پورے کرنا ہی میرے لئے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ میں مزید کوئی فلم سائن کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کم از کم ایک سال تک کے لئے میرے پاس کوئی ڈیٹ نہیں تھی۔ میں نے بڑی عاجزی سے معذرت کی اور انہوں نے خوشدلی سے میری معذرت قبول کر لی۔

راجہ راؤ کے گھر سے کم و بیش بارہ میل کے فاصلے پر خواجہ احمد عباس رہتے تھے۔ ان کا اپارٹمنٹ جس بلڈنگ میں تھا وہ بھی ساحل پر واقع تھی اور اس کا نام خواجہ صاحب نے ہی "سمندر ترنگ" رکھا تھا۔ وہ علاقہ شیواجی پارک کہلاتا تھا۔ خواجہ احمد عباس صاحب بہت مشہور اور بارسوخ ادیب اور صحافی تھے۔ انگریزی کے "فری پریس جرنل" نامی اخبار میں ان کا کالم "دی لاسٹ پیج" ہر طبقے میں مقبول تھا۔ بعد میں جب خواجہ صاحب سے میری دوستی ہوگئی تو مجھے اس دوستی پر فخر محسوس ہوتا تھا۔

خواجہ صاحب کے بعض اہم فلمی شخصیات سے اچھے مراسم تھے اور راجہ راؤ کی خواجہ صاحب سے دوستی تھی۔ چنانچہ راجہ راؤ کو مجھے ان سے متعارف کرانے کا خیال آیا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ ایک نوجوان ہیرو بننے کا شوق دل میں لئے بمبئی آیا ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ اسے بھیج دو۔ میں دوسرے دن جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ میں ان سے مدد لینے اور صرف ان کی سفارش حاصل کرنے وہاں گیا تھا لیکن اس کے بعد تین ہفتے تک میرا قیام انہی کے ہاں رہا۔ خواجہ صاحب کو میں پہلی ملاقات میں ہی اچھا لگا اور انہوں نے اس وقت تک مجھے اپنے ہاں قیام کی اجازت دے دی جب تک مجھے فلمی دنیا میں کوئی "چانس" نہ مل جائے۔

"بازی" میں گیتا بالی کے ساتھ (1951ء)

وہاں میری ایک اور نوجوان، محسن علی سے بھی ملاقات ہوئی جو ڈیرہ دون کے اس اسکول میں پڑھ چکا تھا جہاں میرے بھائی پڑھاتے تھے۔ وہ نوجوان یوں تو اب رائل انڈین ایئر فورس میں پائلٹ تھا لیکن اسے اصل شوق صحافی بننے کا تھا اور وہ رائٹر نیوز ایجنسی کے لئے رپورٹنگ کرنا چاہتا تھا۔ میری اس سے پہلے بھی ڈیرہ دون میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اب ہم اپنی اپنی آنکھوں میں اپنا اپنا خواب بسائے بمبئی میں ملے تو فوراً ہی ہمارے درمیان دوستی ہوگئی۔ وہ روزانہ خواجہ صاحب کے ہاں آتا تھا۔

شام کو ہم نیچے جا کر سمندر کے کنارے دیوار پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے۔ اس دوران روزانہ اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ سے ایک روسی لڑکی نکل کر سمندر کی طرف جاتی اور ہمارے قریب سے گزرتے وقت، مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر "ہیلو" کہتی۔ اس کے بعد اس کے قدم کچھ سست ہو جاتے اور وہ خراماں خراماں سمندر کے کنارے پہنچ کر چہل قدمی شروع کر دیتی۔ ہم گردنیں گھما کر اس وقت تک اس کی طرف دیکھ رہے ہوتے تھے۔

ایک روز اس نے اچانک گھوم کر ہماری طرف دیکھ لیا اور ہم دونوں کو احمقوں کی طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ ہم ذرا کھسیانے ہوگئے لیکن وہ آہستگی سے ہنس دی۔ تب ہم نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ اس لڑکی کا نام اولگا ہے اور ہم دونوں ہی اس سے رسم و راہ بڑھانے کے خواہشمند تھے لیکن کم از کم مجھ میں تو بالکل جرأت نہیں تھی۔ محسن کے بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

آخر ایک روز میں نے ہی محسن کو دھکا دے کر اس کے پیچھے بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے انہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سمندر کے کنارے چہل قدمی کرتے دیکھا۔ تب مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا کہ میں نے خود اولگا کے پاس جانے کی ہمت کیوں نہیں کر لی تھی؟ میں نے اپنی جھجک اور شرمیلے پن پر دل ہی دل میں خود کو بہت برا بھلا کہا اور یہ بھی سوچا کہ میں تو فلم انڈسٹری میں قسمت آزمائی کرنے آیا ہوا تھا، فلم انڈسٹری میں بھلا شرمیلے لوگوں کا کیا کام؟

میں اپنے آپ پر خار کھاتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور دل ہی دل میں عہد کرنے لگا کہ اپنے شرمیلے پن پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ وہی شرمیلا پن جس کے باعث پہلے میں نے اوشا کو کھو دیا تھا اور اب میں اولگا سے بھی راہ و رسم نہیں بڑھا سکا تھا۔ اسی دوران میں نے کیرکٹر ایکٹریس للتا پوار کو گاڑی سے اتر کر اپنے فلیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ خواجہ احمد عباس کے برابر والی بلڈنگ میں رہتی تھیں۔ سڑک پر موجود چند لوگ ان کے پیچھے لپکے۔ ان میں سے کوئی سگریٹ کی خالی ڈبیا پھاڑ کر، کوئی کسی میلے سے کاغذ کے پرزے پر..... اور کوئی کسی نوٹ بک میں ان سے آٹوگراف لینا چاہتا تھا۔ لوگوں کو اس طرح آٹوگراف لینے کے لیے للتا پوار کے پیچھے جاتے دیکھ کر میں حسرت سے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا اسی طرح کبھی لوگ مجھ سے بھی آٹوگراف لینے آیا کریں گے؟

اس دوران چند خزاں رسیدہ، سوکھے پتے ہوا سے اڑ کر سڑک پر میرے سامنے آن گرے۔ میں نے اپنے جوتے سے انہیں کچل دیا۔ ان کی ہلکی سی چرچراہٹ سن کر مجھے ایک بے عنوان اور خفیف سی خوشی حاصل ہوئی۔ شاید ہر انسان کے اندر کہیں، بہت کم یا کچھ زیادہ اذیت پرستی چھپی ہوتی ہے۔ وہ کسی کو شکست دے کر، کسی کو پیروں تلے کچل کر ایک قسم کی فتح مندی یا خوشی محسوس کرتا ہے، چاہے وہ خزاں رسیدہ سوکھے پتے ہی کیوں نہ ہوں۔ بہرحال، اس شام دل ہی دل میں اپنے آپ سے بہت سی باتیں کرنے کے بعد میں نے خود کو ذرا بدلا ہوا انسان محسوس کیا۔ میرے اندر گویا ایک نیا عزم اور حوصلہ کروٹیں لے رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو کچھ باہمت محسوس کر رہا تھا اور بہت دور کہیں مجھے نہ جانے کیوں امید کی کوئی مدھم سی کرن دکھائی دینے لگی تھی!

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

آنجہانی دیو آنند کی داستانِ حیات

اس عورت نے سر اٹھایا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا

قسط : 05

بمبئی غالباً انڈیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کے طول و عرض میں ہر وقت لاکھوں لوگ متحرک اور حالت سفر میں دکھائی دیتے ہیں۔ بجلی کی ٹرینوں، ڈبل ڈیکر اور عام بسوں، ٹراموں اور نہ جانے کن کن چیزوں پر لوگ سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ جنہیں زیادہ دور نہیں جانا ہوتا یا جنہیں کوئی سواری میسر نہیں ہوتی، وہ پیدل ہی جاتے کھائی دیتے ہیں۔

ان میں سے بہت سے بے روزگار ہوتے ہیں۔ وہ ہر روز ایک نئے عزم اور ارادے سے کسی ذریعہ معاش کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ بھی دیگر کامیاب لوگوں کی طرح اپنی بے کیف زندگی میں بہت سے رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ مجھے صرف روزگار کی تلاش نہیں تھی۔ مجھے تو فلم اسٹار بننا تھا۔ مجھے صرف اس حیثیت سے روزگار چاہئے تھا۔ میں روزانہ بہت سی امیدیں دل میں بسا کر، نہا دھو کر، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اس توقع کے ساتھ گھر سے نکلتا کہ میں بہت اسمارٹ نظر آ رہا ہوں۔

میں ڈبل ڈیکر بس کے اوپر والے حصے میں اس سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرنا پسند کرتا تھا جو ڈرائیور کے عین اوپر ہوتی ہے۔ وہاں سے میں گویا سارے شہر کا نظارہ کرتے ہوئے سفر کرتا۔ میری دوسری ترجیح کوئی تیز رفتار لوکل ٹرین ہوتی۔ میری کوئی خاص منزل نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو میں کسی بس میں اس کے آخری اسٹاپ تک جانے کے بعد، اسی میں بیٹھے بیٹھے وہیں واپس آ جاتا جہاں سے چلتا تھا۔ میں بس حرکت میں رہنا چاہتا تھا۔ اس طرح شاید لاشعوری طور پر مجھے یہ اطمینان ہوتا تھا کہ میری جدوجہد جاری ہے اور میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھا ہوں۔

ایک روز میں ٹرین میں بیٹھا تھا کہ ایک اسٹیشن پر میں نے ایک لڑکی کو مسافروں کے ہجوم کے ساتھ اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ پھر وہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور اپنے خیالوں کی دنیا میں بھٹکنے لگا جو میرا محبوب مشغلہ تھا لیکن چند لمحے بعد میں نے گردن ذرا موڑی تو اس لڑکی کو سامنے والی سیٹ پر بیٹھے پایا جس کی میں نے چند لمحے پہلے جھلک دیکھی تھی۔ اسے قریب سے دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ کھلتے ہوئے کسی پھول کی طرح تر و تازہ، خوبصورت اور اچھوتی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے شرمیلے پن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا عہد کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ اس سلسلے میں تجربہ کرنے کا بہترین موقع تھا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد شاید اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ میں تھا جو ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹپٹا کر دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ گردن گھمائی تو مجھے اپنے برابر بیٹھے ہوئے پایا۔

میرا شرمیلا پن جو ہمیشہ لڑکیوں کے معاملے میں میرے راستے میں ایک اونچی دیوار بن کر کھڑا رہتا تھا، آج میں اس دیوار کو پھلانگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے اردگرد بیٹھے لوگوں کی بھی گویا کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اپنی دانست میں اپنے ہونٹوں پر نہایت دلکش مسکراہٹ سجا کر دھیمی آواز میں کہا.....

"ہیلو"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گردن گھما کر کھڑکی سے باہر، پلیٹ فارم کی طرف دیکھنے لگی۔ ٹرین دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے جرأت مندی کا ایک اور مرحلہ عبور کرتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اس بار اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی تاہم اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"اگر میرا بولنا آپ کو ناگوار گزر رہا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں....." میں نے نہایت شیریں لہجے میں کہا "لیکن اگر آپ بتا دیتیں کہ آپ کہاں جا رہی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ میری وجہ سے وہ جو اعصابی تناؤ محسوس کر رہی تھی، وہ اب کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں کوئی لفنگا یا بدمعاش نہیں، بلکہ ایک مہذب اور شائستہ نوجوان تھا۔ آخر اس نے لب کھول ہی دیئے اور ہچکچاتے ہوئے بولی "آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" میں نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

اب شاید وہ بالکل پُرسکون ہو گئی اور ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"دراصل..... اب اس بات کا انحصار اس پر ہو گیا ہے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں۔ جہاں آپ جا رہی ہیں، وہیں میں چلا جاؤں گا۔" میری خود اعتمادی اب لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ میں نے واقعی اپنے شرمیلے پن سے نجات حاصل کر لی تھی اور یکدم جرأت مند ہو گیا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے دھیمی آواز میں کہا "کیا کبھی کسی نے آپ کو بتایا کہ آپ دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہیں؟" میں اپنی دانست میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے صدقِ دل سے یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے گلابی رخسار سرخ ہو گئے۔ مجھے خود اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہو رہی تھیں۔ صرف وہی نہیں شرمائی تھی، اندر ہی اندر میں بھی شرما رہا تھا لیکن بظاہر ایک بے باک فلمی ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں چرچ گیٹ اسٹیشن پر اتروں گی۔" آخر اس نے نیچی آواز میں بتا ہی دیا۔

"اب میں بھی آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں چرچ گیٹ جا رہا ہوں۔" میں نے اسی خود اعتمادی سے کہا جو اچانک ہی نہ جانے کہاں سے مجھ میں آ گئی تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "چرچ گیٹ اسٹیشن پر اتر کر آپ جہاں تک بھی جائیں گی، میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "میں آپ کے گھر تک چلوں گا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ آپ حفاظت سے گھر پہنچ گئی ہیں۔"

اب اس نے ذرا گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ تھی۔

ٹرین چرچ گیٹ اسٹیشن پر رکی تو مسافروں کا ایک ریلا اندر آیا۔ وہ اٹھی تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اس کا بازو یوں تھام لیا جیسے میں اسے ہجوم کی دھکم پیل سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس نے بازو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ گویا یہ سہارا میسر آ جانے پر خوش اور مطمئن تھی۔ میں یکدم اونچی ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو پرنس چارمنگ محسوس کر رہا تھا جو اپنی سنڈریلا کو ہر جانی یا انجانی مصیبت سے بچا کر لے جا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر بھی میں گویا اسے اپنی پناہ میں لے کر چل رہا تھا۔

"تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے۔" میں نے پوچھا۔

"پانچ سات منٹ کا فاصلہ ہے....." اس نے جواب دیا۔ میرے لئے چند منٹ کی یہ متوقع رفاقت کسی بہت بڑی نعمت سے کم نہیں تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لیکن میں تمہیں وہاں تک اپنے ساتھ چلنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ وہاں بلڈنگ کے دروازے پر ہی میرا بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا ہو گا..... اور ان دوستوں میں میرا بوائے فرینڈ بھی شامل ہو گا جو میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"تمہارا بوائے فرینڈ بھی ہے؟" مجھے جھٹکا سا لگا۔

"کیوں..... کیا میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہو سکتا؟" وہ گویا میری کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اور اس سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا....." میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا "تم جیسی حسین لڑکی کا تو لازمی طور پر ایک اچھا سا بوائے فرینڈ ہونا چاہئے۔ یہ تمہارا حق بنتا ہے۔"

"لیکن تمہیں وہ اچھا نہیں لگے گا....." وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی "وہ باڈی بلڈر ہے اور میرے قریب کسی دوسرے لڑکے کو دیکھنا اسے بالکل برداشت نہیں ہے۔"

میں نے اپنے چہرے سے قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میرا دل بجھ گیا تھا۔ میں بظاہر خوش دلی سے مسکراتا رہا۔ آخر وہ ایک جگہ رک کر سڑک کی دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "وہ رہا میرا بھائی..... اس کے دوست..... اور میرا بوائے فرینڈ وہ ہے جو ان

سب میں لمبا تڑنگا اور مضبوط ہے۔"

ایک عمارت کے لکڑی کے گیٹ کے سامنے چند نوجوان کھڑے باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے درمیان اس کے بوائے فرینڈ کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ واقعی ویسا ہی تھا، جیسا اس نے بتایا تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں نے لڑکی کا بازو چھوڑ دیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی "تم نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں؟"

"فی الحال تم اپنے آپ کو میرے لئے گمنام ہی رہنے دو۔" میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ میں اس کے بوائے فرینڈ کے مقابلے میں خاصا دبلا پتلا اور کافی حد تک نازک سا دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکی ان نوجوانوں کی ٹولی تک پہنچی تو وہ سب اسے گھیرے میں لے کر بلڈنگ کے گیٹ سے اندر چلے گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کے بوائے فرینڈ نے اگر مجھے اس کا بازو تھام کر آتے ہوئے دیکھ لیا ہوتا تو شاید ایک ہی گھونسے میں مجھے کئی فٹ دور تک لڑھکا دیتا۔ اس کے باوجود میں ایک عجیب سی فتح مندی کے احساس کے ساتھ، سر ذرا اونچا کئے، بڑے پُروقار انداز میں قدم اٹھاتا واپس جا رہا تھا۔ فتحمندی کا یہ احساس یا خوشی شاید اس لئے تھی کہ آج میں اپنے شرمیلے پن سے مکمل نجات پا کر ایک انتہائی حسین لڑکی کا بازو تھام کر چند منٹ کے لئے اس کا ہمسفر بنا تھا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

اس واقعے کے تقریباً آٹھ نو سال بعد، جب میں اسٹار بن چکا تھا تو اپنی ایک فلم کا پریمیئر شو دیکھنے کے بعد سینما ہال سے باہر نکلا۔ سینما کے سامنے میری پرستار خواتین کا ہجوم تھا جو مجھے دیکھ کر ہیجان زدہ سے انداز میں نعرے لگانے لگیں "دیو..... دیو..... دیو آنند....."

ان کے ہاتھوں میں آٹوگراف بکس تھیں جنہیں لہرا لہرا کر وہ اشارہ کر رہی تھیں کہ میں انہیں آٹوگراف دوں۔ پولیس نے انہیں مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی اور خواتین کا "سیلاب" مجھ تک پہنچ گیا۔ میں دھڑا دھڑ انہیں آٹوگراف دینے لگا۔ اسی دوران ایک مرمریں ہاتھ میری طرف بڑھا۔ اس ہاتھ میں بھی آٹوگراف بک تھی۔

میں نے اپنے دستخط کرنے کیلئے آٹوگراف بک تھامی تو اس مرمریں ہاتھ نے اتنی مضبوطی سے میرا ہاتھ دبوچ لیا کہ میں اس کی طاقت پر حیران رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اس سے بھی زیادہ حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میرا ہاتھ دبوچنے والی نے جذبات کی تمام تر شدت کے ساتھ میرا ہاتھ چوم لیا۔ ان ہونٹوں کی حرارت مجھ جیسے انسان کو پگھلا سکتی تھی لیکن جب اس عورت نے سر اٹھایا اور اس کی زلفوں کی لٹیں اس کے چہرے سے ہٹیں تو میں ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ سن سا ہو گیا۔ نہ جانے یہ وقت کا حسین اتفاق تھا یا کوئی ستم، بہر حال..... میں دنگ رہ گیا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

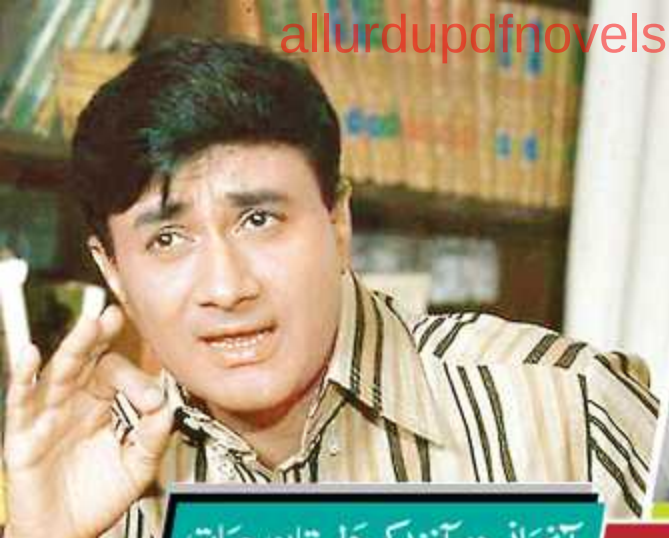

دیو آنند، صحیفہ فلم "کالا پانی" میں (1958ء)

آنجہانی دیو آنند کی داستانِ حیات

بھوک اس دنیا کی ایک سفاک حقیقت ہے

قسط : 06

تمکین تبسم

"یہ میں ہوں....." وہ ایک عجیب قسم کے تفاخر سے بولی۔

"ہاں..... میں نے پہچان لیا....." میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ وہی لڑکی تھی جو آٹھ نو سال پہلے چند منٹ کے لئے چرچ گیٹ اسٹیشن سے کچھ دور تک میری ہمسفر بنی تھی..... یا شاید میں اس کا ہمسفر بنا تھا۔ ان لمحوں کی ایک فلم سی، تیزی سے میری نظروں کے سامنے سے گزر گئی۔

"میں نیلوفر ہوں....." وہ دوسری عورتوں کے شور کے درمیان بولی۔ "اس وقت تم نے میرا نام نہیں پوچھا تھا..... آج تو جان لو....."

"نیلوفر.....!" میں نے بے اختیار پکارنے کے سے انداز میں کہا "تمہارا وہ باڈی بلڈر بوائے فرینڈ کہاں ہے؟"

"اس سے میری شادی ہوگئی تھی..... پھر طلاق بھی ہوگئی....." اس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں کوئی تاسف نہیں تھا۔ پھر وہ ہنس کر بولی "کیا تم مجھے اپنی اگلی فلم میں ہیروئن لو گے؟"

میں ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے، اس کی یہ فرمائش پوری کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

دوسری عورتوں نے نیلوفر کو دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ یہی غنیمت تھا کہ انہوں نے اسے مجھ سے دو چار منٹ بات کرنے کا موقع دے دیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ان سب کو بے دلی سے آٹوگراف دیئے۔ گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ جانے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نیلوفر ایک بار پھر زندگی کے راستے پر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ جا چکی تھی۔ میں اپنی کامیابی کے زمانے کے اس قصے کو چھوڑ کر ایک بار پھر اپنی جدوجہد کے دور کی طرف واپس آتا ہوں۔

☆.....☆.....☆

ایسا لگتا تھا کہ بمبئی میں کوئی کامیابی حاصل کرنے کے لئے مجھے کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ کوئی ایسی شخصیت میری طرف متوجہ نہیں ہو رہی تھی جو میرے مقصد میں کامیاب ہونے کے سلسلے میں میری مدد کر سکتی۔ کوئی ایسی نظر مجھ پر مہربان نہیں ہو رہی تھی جو میرے حالات کو بدلنے میں کوئی کردار ادا کر سکتی۔ میں لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے اپنے پسندیدہ فلمی گانے سناتا۔ اسٹوڈیوز کے چکر لگاتا۔ فلم انڈسٹری کے اہم لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتا، ان سے ملاقاتیں کرتا۔ جہاں بھی امید کی کرن نظر آتی، میں وہاں پہنچ جاتا لیکن کسی بھی طرح کام بنتا دکھائی نہ دیا۔ میں جس راستے پر چل کر منزل پانا چاہتا تھا، اس پر قدم رکھنے کا بھی موقع ملتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس دوران میں نے سوچا کہ خواجہ احمد عباس کی نوازشات اور میزبانی سے مزید فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ سے بیزار ہو جائیں۔ چنانچہ ایک روز میں نے اپنا سامان سمیٹا، اپنا چھوٹا سوٹ کیس تیار کیا اور انہیں مطلع کیا "خواجہ صاحب! مجھے اپنے شہر کا ایک دوست مل گیا ہے۔ میں اس کے ساتھ رہنے جا رہا ہوں۔"

میں جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کہاں جاؤں گا۔ بس بیگ اٹھا لیا تھا۔ خواجہ صاحب اس وقت میز پر سر جھکائے اپنا کالم لکھ رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا "کون سا دوست..... کہاں رہتا ہے وہ؟"

میں نے ایک فرضی نام بتایا اور کہا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ وہ ایک جگہ مجھے لینے آئے گا۔"

خواجہ صاحب نے ٹٹولنے والی نظروں سے میرا سراپا جائزہ لیا۔ شاید انہیں میری بات کے کھوکھلے پن کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ تاہم وہ سر ہلا کر بولے۔ "ٹھیک ہے..... بہرحال..... رابطے میں رہنا، اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔"

میری جیب میں تھوڑے سے پیسے تھے لیکن نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے اطمینان دلا رہی تھی کہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ شاید یہ نوجوانی کی توانائی اور اعتماد تھا۔ میں بس میں بیٹھا اور جیب میں جو آخری چند آنے بچے تھے، ان کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری منزل کہاں تھی، اس لئے میں نے آخری اسٹاپ کا ٹکٹ لیا تھا۔

کنڈکٹر نے جب آواز لگائی "وکٹوریہ ٹرمینس....." تو میں بس سے اتر گیا اور ہارن بائی روڈ کی طرف چل دیا۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے جیبوں میں ہاتھ مارا کہ شاید کسی کونے کھدرے میں کوئی بچا کھچا سکہ پڑا ہو لیکن ایک جیب سے ایک رومال کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ رومال سے مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے اپنے یوڈی کلون کے آخری چند قطرے اس پر چھڑکے ہوئے تھے۔

"ڈارلنگ ڈارلنگ" میں زینت امان کے ساتھ (1977ء)

میں چلتا رہا اور بھوک بڑھتی رہی۔ آخر کار ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی مخلوق دانتوں سے میرے معدے کو کتر رہی ہو۔ ہاتھ میں لٹکا ہوا چھوٹا سا سوٹ کیس مجھے بہت بھاری لگنے لگا۔ بازار میں خوب رونق تھی۔ سڑک کے دونوں طرف دکانیں سجی ہوئی تھیں جن میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ ٹھیلوں اور خوانچوں والے بھی آوازیں لگا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جگہ جادو کے کرتب دکھانے والا بھی موجود تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ کر اور بعض چیزوں کی خوشبو ہوا میں محسوس کر کے میرے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

اچانک ایک شخص پر میری نظر پڑی جو فٹ پاتھ پر ایک اسٹینڈ پر شوکیس سجائے کھڑا تھا۔ یہ اس کی چلتی پھرتی دکان تھی اور وہ دنیا بھر کے کمیاب اور نایاب ٹکٹوں کی خرید و فروخت کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میرے سوٹ کیس میں بھی ایک البم موجود تھی جس میں، میں نے اس قسم کے بہت سے ڈاک ٹکٹ نہایت شوق سے جمع کر رکھے تھے۔ یہ میرا انمول خزانہ تھا جو مجھے بہت عزیز تھا لیکن بھوک اس دنیا کی ایک نہایت ہی سفاک حقیقت ہے۔ اس وقت کچھ رقم حاصل کرنے کا میرے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔

میں نے البم دکاندار کو دکھایا تو اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک آ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سارے نہیں، بلکہ ایک چوتھائی ڈاک ٹکٹ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ سودے بازی شروع ہوئی۔ وہ ایک خرانٹ اور شاطر دکاندار تھا لیکن اس وقت مجھ میں بھی نہ جانے کہاں سے، کچھ چالاکی آ گئی۔ میں نے ہوشیاری سے سودے بازی جاری رکھی۔ ایک دو بار مایوسی کا اظہار کر کے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کی۔ سودا دس روپے سے شروع ہو کر آخر کار تیس روپے پر ختم ہو گیا۔

پیسے ہاتھ میں آنے کے بعد میں نے ندیدوں کی طرح پیٹ کی آگ بجھائی اور ایک بار پھر آگے چل پڑا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، میں کہاں جا رہا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں میرے لئے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے پچھتاوا محسوس ہونے لگا کہ عباس صاحب سے جھوٹ بول کر مجھے ان کے گھر سے نکلنے میں اتنی جلد بازی نہیں دکھانی چاہئے تھی۔ میں چلتے چلتے بے خیالی میں سڑک کے بیچ میں آ گیا اور وہیں رک کر، آنکھیں بند کر کے نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔ میری وجہ سے بہت سی گاڑیوں کو رکنا پڑا۔ گاڑیوں کے ہارن، ڈرائیوروں کی چیخ پکار اور ان میں سے بعض کی گالیاں سن کر میں خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آیا اور جلدی سے واپس فٹ پاتھ پر پہنچ گیا۔

اسی لمحے کسی نے مجھے پکارا "دیو....."

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میرے اسکول کے زمانے کا کلاس فیلو تارا تھا جو والد کی طرف سے میرا دور پار کا رشتے دار بھی تھا۔ کسی اجنبی شہر میں بچپن کا کوئی شناسا مل جائے تو عجیب ہی خوشی ہوتی ہے۔ ہم والہانہ انداز میں ملے۔

جذبات ذرا ٹھنڈے پڑے تو اس نے پوچھا "بمبئی میں کیا کر رہے ہو؟"

"کام ڈھونڈ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اب ہم دونوں مل کر کام ڈھونڈیں گے۔" جب اسے پتا چلا کہ میرے پاس اس وقت، رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں، تو اس نے بتایا "میں ایک بلڈنگ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنے بھائی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ ہم کرایہ شیئر کرتے ہیں۔ وہ نیوی میں ہے اور اس کمرے میں کم ہی رہتا ہے۔ تم چاہو تو اس میں ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔"

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں فوراً اس کے ساتھ چل دیا۔ بمبئی میں اس زمانے میں بھی کئی منزلوں پر مشتمل، اس قسم کی ہزاروں عمارتیں تھیں جن میں ہر منزل پر بہت سے چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے تھے۔ ہر فلور کے تمام مکینوں کے لئے باتھ روم مشترک ہوتا تھا۔ اب ان کی تعداد اور بھی نہ جانے کتنی بڑھ چکی ہے۔ ان عمارتوں کو "چال" کہا جاتا تھا۔ تارا جس "چال" میں رہتا تھا اس کا نام "کرشنا نواس" تھا۔ یہ پانچ منزلہ تھی اور اس کے بعض کمروں میں جوڑے بھی رہ رہے تھے۔

میں نے یہاں چند ماہ تارا کے ساتھ گزارے۔ اس کا بھائی کمرے میں کم ہی رہتا تھا۔ جب وہ کمرے میں ہوتا اور اس کی گرل فرینڈ اس سے ملنے آ جاتی تو مجھے اور تارا کو گھنٹے دو گھنٹے کے لئے باہر جانا پڑتا۔ قریب ہی ایک ایرانی ریسٹورنٹ بھی تھا جہاں سستا، مگر بہت اچھا کھانا ملتا تھا۔ جب میری تیس روپے کی پونجی ختم ہو گئی اور اسٹوڈیوز کے چکر لگانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو مجبوراً میں نے ایک کمپنی میں اکاؤنٹس کلرک کے طور پر 80 روپے ماہوار پر نوکری کر لی۔

یہ ملازمت مجھے جلد ہی چھوڑنی پڑی کیونکہ اس میں نہ تو دل لگتا تھا اور نہ ہی مجھے اکاؤنٹس کی کچھ زیادہ سمجھ تھی۔ اس زمانے میں دوسری عالمی جنگ جاری تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے فلورا فاؤنٹین کے مقام پر ایک بڑی بلڈنگ میں سنسر شپ ڈیپارٹمنٹ قائم کر رکھا تھا جس میں ڈاک بھی سنسر ہوتی تھی۔ اس محکمے کی طرف سے اخبار میں چند نوجوانوں کی ضرورت کا اشتہار آیا، جن کی انگریزی اچھی ہو۔

میں نے درخواست بھیج دی۔ انٹرویو لینے والوں نے میری، گورنمنٹ کالج لاہور سے انگلش آنرز کی ڈگری اور پرنسپل، پروفیسر ڈکنسن کے دستخط کے ساتھ کیریکٹر سرٹیفکیٹ دیکھا تو مجھے فوراً رکھ لیا۔ یہاں تنخواہ بھی 165 روپے ماہوار تھی، جو اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی اور کام بھی دلچسپ تھا۔ فوجیوں اور دیگر لوگوں کے خطوط کھول کر پڑھنا واقعی ایک دلچسپ کام تھا۔ ان میں انتہائی نجی اور جذباتی خطوط بھی ہوتے تھے۔ ایک بہت بڑے ہال میں ایک بہت بڑی میز کے گرد ہم بہت سے لڑکے لڑکیاں بیٹھ کر خطوط پڑھتے تھے اور ضرورت پڑتی تھی تو انہیں سنسر کرتے تھے۔ مختصر سی ٹریننگ میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ کون کون سی باتیں سنسر کی زد میں آتی تھیں۔ نجی معاملات کو ہم نہیں چھیڑتے تھے۔

اسی دوران میرے بڑے بھائی چیتن آنند بھی ڈیرہ دون کے شاندار اسکول میں ٹیچر کی ملازمت چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لئے بمبئی آ گئے۔ دراصل ان کا رجحان بھی تخلیقی کاموں کی طرف تھا۔ وہ خاص طور پر فلمی دنیا کے تین شعبوں، ایکٹنگ، ڈائریکشن اور اسکرپٹ رائٹنگ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اسی چھوٹے سے کمرے میں رہنے لگے۔ اب اس کمرے میں ہم چار افراد ہو گئے۔ اس بلڈنگ کے کسی بھی اور کمرے میں شاید اتنے افراد نہیں تھے۔

میری گزر بسر اب اچھی ہونے لگی تھی۔ میں تو تنگدستی کے دنوں میں بھی بن ٹھن کر رہتا تھا۔ اب اور بھی بہتر حلیے میں رہتا۔ کبھی کبھی بوقت ضرورت میں تارا کو قرض حسنہ قسم کا ادھار بھی دے دیتا لیکن ملازمت کا مجھے ایک نقصان یہ تھا کہ فلم اسٹوڈیوز میں قسمت آزمائی کے لئے وقت نہیں مل پاتا تھا۔ چیتن نے کچھ دنوں بعد باندرہ کے علاقے پالی ہل میں ایک پہاڑی پر واقع ایک مکان کی نچلی منزل کرائے پر لے لی۔ یہ افسانوی اور فلمی قسم کا مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا اور ایک اینگلو انڈین جوڑے کی ملکیت تھا۔ یہ جوڑا خود اوپر کی منزل پر رہتا تھا۔ چیتن شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ تھے۔ انہیں معقول مکان مل گیا تو انہوں نے اپنی فیملی کو بھی بلا لیا۔ یہ مکان پوش علاقے میں تھا۔ یہاں کے بیشتر بنگلے انگریزوں یا اینگلو انڈین لوگوں کی ملکیت تھے۔

میرے آفس میں تھوڑے ہی دنوں میں سب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں درحقیقت ہیرو بننے کے لئے بمبئی آیا ہوں۔ خطوط سنسر کرنے والے آٹھ دس افراد میں آدھی لڑکیاں تھیں۔ وہ اسمارٹ، ماڈرن اور پڑھی لکھی لڑکیاں تھیں اور اکثر کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ہم سب ہی ڈاک سنسر کرتے وقت کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔ اس کی وجہ، بعض ایسی باتیں ہوتی تھیں جو ہم خطوط میں پڑھتے تھے.....

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

فلمی ستارے آسمان کے تاروں کی طرح رسائی سے باہر ہوتے ہیں

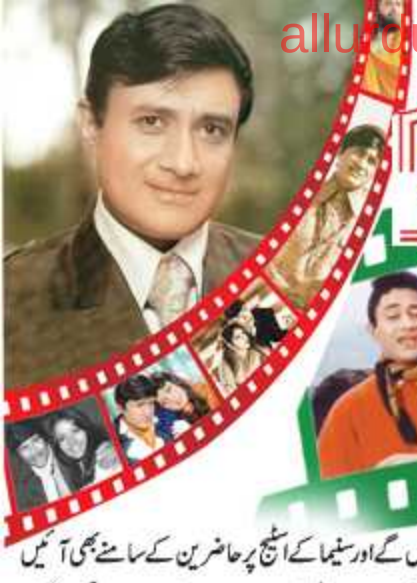

قسط : 07

وہ 1945ء کا زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم انہی دنوں ختم ہوئی تھی۔ ایک تو ملک پر اس جنگ کے اثرات باقی تھے۔ دوسری طرف انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے تحریک بھی زوروں پر تھی۔ ملک بدامنی، اضطراب اور ہلچل کا شکار تھا۔ بیروزگاری بھی عروج پر تھی لیکن میں اپنی سنسر آفس والی ملازمت کی وجہ سے مزے میں تھا۔ میری رہائش بھی باعزت تھی، کیونکہ میں اب اپنے بڑے بھائی چیتن کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ انہوں نے باندرہ کے علاقے پالی ہل میں چھوٹی سی ایک پہاڑی پر واقع ایک افسانوی قسم کے مکان کی نچلی منزل کرائے پر لی ہوئی تھی۔

ان کے ہاں اکثر انٹلکچوئل ٹائپ لوگوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ ان میں فن وادب کے دلدادہ، سیاست سے دلچسپی رکھنے والے، انقلابات کے خواب دیکھنے والے..... غرضیکہ ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ ان کی اکثریت بیروزگار تھی۔ وہ سب اِدھر اُدھر اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ انہیں کامیابی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے کا موقع ملے۔ میں اچھی تنخواہ پر ملازم ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ان لوگوں کے درمیان خوش قسمت محسوس کرتا تھا۔

تین دوست..... تین لیجنڈری فنکار..... دلیپ کمار، راج کپور، دیوآنند

چیتن کے بنگلے میں شعروسخن، قوالی اور موسیقی وغیرہ کی محفلیں سجتی رہتی تھیں۔ ان محفلوں کے بغیر بھی وہاں اکثر کسی تقریب جیسا سماں رہتا تھا۔ کبھی یہاں پنڈت روی شنکر ستار بجاتے سنائی دیتے اور کبھی استاد علی اکبر خان سرود پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے۔ زہرہ سہگل اور ان کی چھوٹی بہن عذرا ممتاز بھی اسی علاقے میں رہتی تھیں اور کبھی کبھی ان محفلوں کو اپنی موجودگی سے جگمگانے آ جاتی تھیں۔ وہ دونوں اسٹیج کی معروف اداکارائیں تھیں اور اداکاروں کے گروپ تھوی راج کپور کے تھیٹر سے وابستہ تھیں۔ بلراج ساہنی بھی اپنی خوبصورت بیوی دمیانتی کے ساتھ یہاں آتے تھے۔ وہ بی بی سی کی فارن سروس سے کچھ عرصہ وابستہ رہنے کے بعد انگلینڈ سے واپس آئے تھے۔ یہاں آنے والے لوگوں میں سب سے پہلے انہیں ہی ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔

دیوآنند کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 47 سال کی عمر میں وہ اپنے سے آدھی عمر کی ہیما مالنی کے ساتھ ''جونی میرا نام'' (بڑی تصویر) میں اور 49 سال کی عمر میں نووارد اداکارہ زینت امان کے ساتھ ''ہرے راما ہرے کرشنا'' (چھوٹی تصویر) میں ہیرو آئے۔

میری وہاں موجودگی کو کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ مجھے بس ایک خوش شکل، خوش لباس اور خوش اطوار لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ چیتن نے جلد ہی ''نیچا نگر'' کے نام سے اپنی ذاتی فلم بنا ڈالی۔ کانز فلم فیسٹیول اسی زمانے میں شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے ہی سال میں اس فلم کو وہاں گولڈن پام ایوارڈ مل گیا۔ خواجہ احمد عباس بھی بائیں بازو سے اپنی وابستگی اور ترقی پسندی کی روشنی میں ''دھرتی کے لعل'' کے نام سے فلم بنا رہے تھے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک فلم بنانے والا میرا بھائی تھا اور دوسری فلم بنانے والا میرا مہربان اور اچھا شناسا..... مگر دونوں ہی کی فلموں میں میرے لئے کوئی موزوں کردار نہیں نکل سکا۔

میں نے اس چیز کو دل پر نہیں لیا۔ میں ہر حال میں خوش رہنے والا اور اکثر ناخوشگوار اتفاقات کو نظرانداز کر دینے والا آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ قسمت ایک روز ضرور مجھ پر مہربان ہوگی۔ تاہم اب اپنی ملازمت سے میرا دل اچاٹ ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کے لئے وقت نہیں ملتا تھا۔ مجھے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ منزل خود چل کر تو انسان کے پاس نہیں آتی، انسان کو خود اپنی منزل تلاش کرنی، اور اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میرا اضطراب اور بے چینی روز بہ روز بڑھنے لگی۔

ایک روز میں سنسر آفس میں بیٹھا ایک آرمی آفیسر کا خط پڑھ رہا تھا جس کی شادی کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسے محاذ پر جانا پڑ گیا اور ابھی تک اسے گھر واپس آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اپنی بیوی کے نام اپنے اس خط میں اس نے اپنے سلگتے ہوئے جذبات بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھا تھا۔ ''میرا بس چلے تو ابھی اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔''

یہ جملہ گویا میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ میں یکدم ہی اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ اگر مجھے اپنی منزل پر پہنچنا ہے تو مجھے اپنی ملازمت کو خیرباد کہنا ہوگا۔ میں اسی روز استعفیٰ لے کر اپنے آفیسر کیپٹن سائمن کے پاس پہنچ گیا جو ایک خوش مزاج نوجوان انگریز تھا۔ میرا استعفیٰ دیکھ کر وہ سمجھا کہ شاید مجھے فلمی دنیا سے بلاوا آ گیا ہے اور فوری طور پر مجھے کسی فلم میں ہیرو کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں کسی بلاوے کے بغیر ہی ملازمت چھوڑ کر جا رہا تھا، تو وہ خاصا حیران ہوا۔

کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد اس نے مجھے خدا حافظ کہنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا۔

''جب تم ہیرو بن جاؤ تو ہم لوگوں کو بھول نہ جانا۔''

میرے تمام ساتھی مردوں اور لڑکیوں نے گرمجوشی اور نیک تمناؤں کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا۔ ان میں سے ایک لڑکی جس سے میری چند منٹ کی ایک نیم رومانی..... لیکن بے مقصد سی ملاقات بھی رہی تھی، چند سال بعد، جب میں ایک کامیاب فلمی ہیرو بن چکا تھا، مجھے ایک اسٹوڈیو میں ریسپشنسٹ کے طور پر بیٹھی ہوئی ملی۔

ملازمت کو خیرباد کہنے کے بعد میں ایک بار پھر اس لوکل ٹرین میں آ بیٹھا جس کے ذریعے روزانہ گھر جاتا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایک سیٹ پر بیٹھتے ہی میں حسب معمول اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ ٹرین دھچکے سے اگلے اسٹیشن پر رکی تو میں ذرا چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آیا۔ پلیٹ فارم پر ایک فلم کا بڑا سا پوسٹر لگا ہوا تھا، جس پر اشوک کمار کا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اشوک کمار پلیٹ فارم پر کھڑے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ رہا تھا تو پلازا سنیما میں اشوک صاحب کی فلم ''بندھن'' لگنے والی تھی۔ پتا چلا کہ اس فلم کے پریمیئر شو پر اشوک صاحب بمبئی سے لاہور آئیں گے اور سنیما کے اسٹیج پر حاضرین کے سامنے بھی آئیں گے۔ اس شو کے موقع پر میں بھی اپنے کالج کے چند دوستوں کے ساتھ بھاگم بھاگ پلازا سنیما پہنچا۔ یہ تصور ہی ہمارے لئے ہیجان خیز تھا کہ آج فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہم اشوک صاحب کو حقیقت میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے۔

سنیما ہاؤس پہنچ کر ہمارا یہ خواب ٹوٹ کر بکھر گیا۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ ہم ٹکٹ ہی نہ لے سکے اور کافی دیر دھکے کھانے کے بعد واپس آ گئے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ فلموں کے ستارے آسمان کے تاروں کی طرح ہماری رسائی سے باہر ہوتے ہیں..... لیکن آج پلیٹ فارم پر اشوک صاحب کی مسکراتی تصویر دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ آج میں کم از کم اس شہر میں تو ہوں جہاں اشوک صاحب رہتے ہیں۔ اگر میں فلمی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں تو پھر اشوک صاحب سے میری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ وہ، اور ان جیسے دوسرے بہت سے فلمی ستارے میری رسائی سے دور نہیں رہیں گے۔

''ہیلو دیو.....!'' اچانک کسی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''میں تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔''

میں نے چونک کر سامنے والی سیٹ کی طرف دیکھا۔ مجھے مخاطب کرنے والا ''مسوریکر'' نامی ایک نوجوان تھا جس سے میری رسمی سی شناسائی تھی۔ میں نے گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور دریافت کیا کہ وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟

''پربھات فلم کمپنی کو اپنی نئی فلم کے لئے ایک ہینڈسم نوجوان کی ضرورت ہے۔ فلم کا سیٹ لگ چکا ہے لیکن آخری وقت میں ہیرو کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ تمہیں قسمت آزمائی کا اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا۔'' اس نے مجھے دفتر کا پتا سمجھایا اور بتایا۔ ''باس کا نام بابوراؤ پائی ہے۔''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے کچھ بے یقینی کے سے انداز میں پوچھا۔ کیا وہ مجھ سے مل لیں گے؟''

''یقیناً مل لیں گے۔ تم جاؤ تو سہی..... صبح دفتر کھلنے سے پہلے پہنچ جاؤ۔ وہ اگر دفتر سے باہر تمہیں دیکھ لیں گے تو ضرور اندر بلا لیں گے۔'' اس نے میری ہمت بندھائی۔

میں نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ وہ ایک شوقیہ گلوکار تھا۔ کچھ دنوں پہلے مجھے خود موسیقی کا شوق ہوا تھا۔ تو میں نے چھوٹے سے ایک میوزک اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ وہاں اس سے شناسائی ہوئی تھی۔ وہ اسٹوڈیوز میں چکر لگاتا رہتا تھا، اس لئے فلمی دنیا کی بہت سی خبروں سے آگاہ رہتا تھا۔ یہ بڑی بات تھی کہ اس نے میرے مطلب کی خبر کے سلسلے میں مجھے یاد رکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خود اس کی اپنی منزل کیا تھی۔ بہرحال وہ ہمیشہ بڑی سنجیدگی سے کہیں نہ کہیں آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ ہمیشہ سوٹ میں ہوتا تھا۔ ٹائی بھی لگی ہوتی تھی اور انگریزوں کی طرح چھتری بغل میں ہوتی تھی۔

دوسری صبح میں منہ اندھیرے اٹھ کر تیار ہوا اور پربھات فلم کمپنی کے دفتر کا دروازہ کھلنے سے پہلے میں وہاں موجود تھا۔ چپراسی نے جاننا چاہا کہ میں کون ہوں۔

''مسٹر بابوراؤ پائی مجھے جانتے ہیں۔'' میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''وہ کب آئیں گے؟''

''یہ تو وہ خود ہی جانتے ہوں گے۔ ان کا آنے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ کبھی تو وہ کئی کئی دن نہیں آتے۔'' اس نے بھی بے نیازی سے جواب دیا۔ اندر ہی اندر میرا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا لیکن میں بہرحال ایک طویل انتظار کیلئے تیار ہو گیا۔

خوش قسمتی سے مجھے طویل انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی میں نے چپراسی کو ہڑبڑا کر اٹھتے دیکھا۔ وہ نہایت مؤدب ہو کر ایک شخص کو سلام کر رہا تھا جو ایک لمحہ پہلے برآمدے میں داخل ہوا تھا۔ چھوٹے سے قد کا وہ سانولا سا آدمی ڈارک براؤن سوٹ میں تھا۔ چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ تیل سے چمکتے ہوئے بال چھدرے تھے لیکن سلیقے سے سر پر جمائے گئے تھے۔ سر کے وسط میں مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چپراسی کے انداز کو دیکھ کر میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہی بابوراؤ پائی تھے۔ انہوں نے اچٹتی ہوئی سی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ چپراسی بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔

قسمت اس وقت مجھ پر مہربان تھی۔ چند ہی لمحوں بعد چپراسی باہر واپس آیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اندر جا پہنچا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں ''فینس اسٹوڈیوز'' اور ''پربھات فلم کمپنی'' کے مالک کے سامنے کھڑا تھا اور اس تک پہنچنے کے لئے مجھے کوئی سفارش استعمال نہیں کرنی پڑی تھی۔

بابوراؤ نے چشمہ اتار کر میری طرف دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بلاتمہید پوچھا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''دیوآنند..... سر!'' میں نے نہایت مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''نام تو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے.....'' انہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ چند منٹ کی گفتگو میں انہوں نے مجھے اور میرے فلسفۂ حیات کو تھوڑا بہت جاننے کی کوشش کی، اس دوران وہ بات کرتے ہوئے ہنسنے بھی لگے تھے۔ میں خود اعتمادی کا پیکر بنا ہوا تھا اور متاثر کن اسٹائل اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کس لئے آئے ہو؟'' آخر کار انہوں نے پوچھا۔

''سر..... میرا خیال ہے جب میں نے اس کمرے میں قدم رکھا، آپ اس وقت ہی اچھی طرح جان چکے تھے کہ میں کس لئے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔ ''لیکن فلم کی کاسٹ میرے ڈائریکٹر مسٹر پی ایل سنتوشی منتخب کرتے ہیں۔ وہ کل ایک بجے یہاں ہوں گے۔ تم بھی اس وقت آ جاؤ۔''

''میں پندرہ منٹ پہلے آ جاؤں گا سر!'' میں نے ممنونیت سے کہا اور ان کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔

میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور مجھے حالات کے تاریک افق پر روشنی کی ایک واضح کرن دکھائی دے رہی تھی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

آنجہانی دیو آنند کی داستانِ حیات

پنکی

اپنے کمرے میں میری منتظر تھی

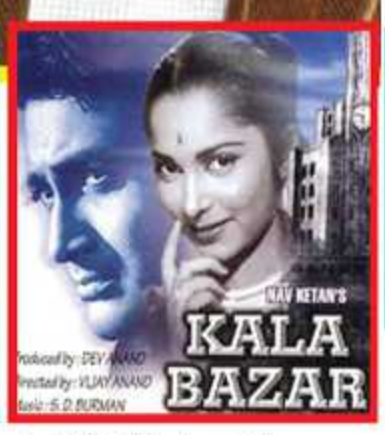

تمکین تبسم

قسط : 08

دوسرے روز میں ایک بجے سے پہلے ہی فینس اسٹوڈیو میں بابوراؤ کے دفتر کے باہر، برآمدے میں موجود تھا۔ ٹھیک ایک بجے، چھوٹے قد کا ایک گول مٹول سا آدمی وہاں پہنچا جس کی چندیا اور جوتوں کی چمک ایک جیسی تھی۔ وہ سوٹ میں تھا۔ چپراسی نے جس طرح اسے سلام کیا، اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ ڈائریکٹر پی ایل سنتوشی تھا۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد اندر گھنٹی بجی اور چپراسی جلدی سے اندر چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی اس نے باہر واپس آکر مجھ سے کہا ''صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

اس کا مطلب تھا کہ بابوراؤ نے سنتوشی کے آتے ہی اسے میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں اندر پہنچا تو بابوراؤ نے سنتوشی سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے سنتوشی کی پہلی نظر میں ہی اپنے لئے پسندیدگی محسوس کی لیکن وہ بہت عجلت میں دکھائی دیتا تھا۔ بلا تمہید بولا ''نوجوان! ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ سیٹ لگا ہوا ہے جس پر اب تک شوٹنگ شروع ہو جانی چاہئے تھی۔ تمہیں کل ہی پونا جا کر آڈیشن دینا ہوگا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟''

''بالکل تیار ہوں۔'' میں نے بلا تامل جواب دیا۔

''میں تمہارے لئے دکن کوئین کا ٹکٹ منگوا دیتا ہوں۔ اس ٹرین کے ذریعے تم پونا جاؤ گے۔ وہاں اسٹیشن پر ہمارے اسٹوڈیو کی ویگن تمہاری منتظر ہوگی۔ تمہارے آڈیشن وغیرہ کے تمام انتظامات ہمارے پونا والے اسٹوڈیو میں مکمل ہوں گے۔ میں خود بھی وہاں موجود ہوں گا۔ میں ہی تمہارا آڈیشن اور اسکرین ٹیسٹ لوں گا۔''

گو کہ آڈیشن اور اسکرین ٹیسٹ وغیرہ کی بات سن کر میں اندر ہی اندر تھوڑا سا نروس ہو گیا تھا لیکن بظاہر میں نے اپنی خود اعتمادی برقرار رکھی اور مستعدی سے کہا ''ٹھیک ہے سر!''

سنتوشی نے جب میری تعلیم اور بمبئی میں میری رہائش وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو اور بھی زیادہ مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے اچھی انگریزی بولنے پر میری تعریف بھی کی۔ میں ذرا اور پُراعتماد ہو گیا۔

دوسرے روز صبح سویرے ٹرین کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ میرے گھر پہنچ گیا۔ شام سے پہلے میں پونا کے ''پربھات فلم اسٹوڈیو'' میں موجود تھا۔ اس اسٹوڈیو میں داخل ہوتے وقت اس احساس سے میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں کہ یہاں بنی ہوئی کئی فلمیں میں نے اس زمانے میں لاہور میں دیکھی تھیں جب میں وہاں گورنمنٹ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک روز میرے قدم اس اسٹوڈیو تک پہنچیں گے۔ پھر جب مجھے میک اپ روم میں کرسی پر بٹھایا گیا اور میرا میک اپ شروع ہوا تو میں نے اپنے آپ کو ذرا اہم آدمی محسوس کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کرسی پر نہ جانے کون کون سے مشہور اداکار بیٹھے ہوں گے۔

میک اپ مین اپنے کام کے دوران بار بار میرے چہرے کو اِدھر اُدھر کر کے مختلف زاویوں سے میرا تنقیدی جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے چہرے مہرے سے مطمئن تھا اور میرا میک اپ کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میک اپ ختم ہوا تو ایک ڈریس مین میرے لئے کرتا اور دھوتی لے کر آیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی دھوتی نہیں باندھی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر مجھے اداکار بننا ہے تو مجھے ہر طرح کا بہروپ بھرنا اور ہر طرح کا لباس پہننا پڑے گا۔ میرے لئے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ اس وقت مجھے ہیرو کے کردار کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔

آخر کار مجھے سیٹ پر لے جایا گیا جہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ چاروں طرف بڑی بڑی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ چھت سے بھی لائٹس جھانک رہی تھیں۔ فرش پر بجلی کی تاروں کا جال سا بچھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ جب کیمرا میرے سامنے آیا اور لائٹس میرے چہرے پر پڑیں تو میں نروس نہیں ہوا۔ سنتوشی کی آواز قریب سے آئی ''تم بتا رہے تھے کہ تم نے خواجہ احمد عباس صاحب کے ڈرامے ''زبیدہ'' میں ایک رول کیا تھا۔ تمہیں اگر اس کے مکالمے یاد ہیں تو ذرا اسی کردار کے انداز میں بول دو۔''

میں نے ان سے اجازت لے کر، ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے ذہن پر زور دیا۔ اس ڈرامے میں میرا ایک ثانوی سا رول تھا۔ خواجہ صاحب کے گروپ کے لوگ مجھے بچہ سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن اس وقت میں اپنی زندگی کے اہم موڑ پر تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا ''اس وقت تمہارے چہرے پر جو لائٹس پڑ رہی ہیں، یہی وہ امید کی کرنیں ہیں جن کا تمہیں انتظار تھا۔ یہ تمہاری زندگی کا فیصلہ کن لمحہ ہے۔ آج تمہارا وہ سفر شروع ہو سکتا ہے جو ان لوگوں کو حیران کر دے گا جو تمہیں بچہ اور بے صلاحیت سمجھ کر نظر انداز کرتے تھے۔''

ایک گہری سانس لے کر میں نے آنکھیں کھولیں اور مکالمے بولنے شروع کئے۔ آخر کار مکالمے ختم ہو گئے اور سنتوشی کی آواز گونجی ''کٹ.....''

کیمرا بند ہو گیا اور بیشتر لائٹس آف ہو گئیں۔ میں نے ارد گرد موجود لوگوں کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کے چہروں پر اطمینان اور خوشی نظر آئی۔ سنتوشی مسکراتے ہوئے بولا ''تمہاری خود اعتمادی قابلِ داد ہے۔''

کیمرا مین نے نیچی آواز میں لقمہ دیا۔ ''چہرہ اور مسکراہٹ اچھی ہے۔''

''لیکن ہمیں تمہارے دانتوں میں دو جگہ تھوڑی سی فلنگ کرانی پڑے گی۔ خالی جگہ کو بھروانا پڑے گا۔'' سنتوشی بولا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے دانتوں کے درمیان دو جگہوں پر معمولی سا فاصلہ تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ فلمی کیمرے کی نظر میں یہ ایک نقص ہوگا۔

سنتوشی مجھے ذرا فکر مند دیکھ کر بولا ''خیر..... تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ جلد از جلد کب کام شروع کر سکتے ہو؟ ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔ تمہیں یہیں، پونا میں کام کرنا ہوگا۔''

''مجھے اپنا سامان لینے بمبئی جانا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''جلد از جلد اپنا سامان لے کر آجاؤ..... اور جانے سے پہلے اوپر کی منزل پر اسٹوڈیو کے منیجر سے مل لو۔'' سنتوشی نے اپنے مخصوص عجلت بھرے انداز میں کہا۔

میں اوپر گیا تو وہاں میرے لئے معاہدے کا ٹائپ شدہ خط تیار رکھا تھا۔ مجھے تین سال کے لئے ''پربھات فلمز'' نے چار سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا تھا۔

خوشی اور ہیجان سے میری یہ حالت تھی کہ جب میں بمبئی، اپنے گھر واپس پہنچا تو مجھے بخار چڑھ چکا تھا۔ مجھے صحت یاب ہونے میں سات دن لگ گئے۔ اس دوران میرے لئے دو مرتبہ پونا سے فون آیا۔ وہاں بے چینی سے میرا انتظار ہو رہا تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد میں اپنی جیب سے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید کر نائٹ ٹرین سے پونا روانہ ہوا تو اپنے چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں اکیلا تھا اور نہایت خوش کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی تو کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ذرا بھاری جسامت کی ایک عورت شرارت بھرے انداز میں ہنستی ہوئی اندر آگئی۔ اس کی عمر 35 سال کے قریب ہوگی۔ اس کا حلیہ اور پہناوا امیرانہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک مرد بھی اسی کے انداز میں ہنستا ہوا آرہا تھا۔ وہ اینگلو انڈین معلوم ہوتا تھا۔ دونوں شاید ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ مرد نے عورت کو اوپر والی برتھ پر چڑھایا اور اس کے ساتھ ہی خود بھی چڑھ گیا۔ انہوں نے میری طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ ان کے رویے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کمپارٹمنٹ میں موجود ہی نہیں ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین روانہ ہوئی تو اس کی کھٹ کھٹ کے درمیان اوپر سے ایسی آوازیں آنے لگیں کہ میں شرمندہ سا ہو گیا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دونوں نے اپنے جذبات کی تسکین کے لئے عجیب ٹھکانا ڈھونڈا تھا۔ کافی دیر بعد اگلا اسٹیشن آیا تو مرد اطمینان سے اترا اور رخصت ہو گیا۔ عورت اوپر کی برتھ پر ہی موجود رہی۔ ٹرین دوبارہ روانہ ہوئی تو عورت اوپر سے اتر کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر لباس نہ ہونے کے برابر تھا۔

''ہیلو ہینڈسم.....!'' وہ ایک عجیب، نشیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر، ایک انگلی سے میرا گال چھوتے ہوئے بولی۔ مجھے اپنے کانوں کی لویں تپتی اور اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔ اس عورت کے ساتھی کے جانے کے بعد بھی اس کے جذبات کا طوفان سرد نہیں ہوا تھا اور اس نے مجھے آن دبوچا تھا۔ اس کی بانہیں میرے گلے میں حمائل ہو گئیں۔ میں جتنا شرماتا رہا، اس کی پیش قدمی اتنی ہی بڑھتی گئی۔

اس نے تمام حدیں پھلانگ ڈالیں۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عورت سے قربت کی انتہا کیا ہوتی ہے۔ تاہم وہ اوپر کی برتھ پر واپس جاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر قدرے مایوسی سے بولی۔ ''تم آج کل کے نوجوان بھی بس یونہی ہوتے ہو..... تم سے اچھا تو میرا وہ دوست تھا جو میرے ساتھ تھا.....'' لیکن پھر وہ گویا مجھے تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔ ''خیر..... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم تیز اور تجربہ کار ہو جاؤ گے۔''

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ میں تو بس دم بہ خود بیٹھا تھا اور مجھ پر جو کچھ بیتی تھی، اس پر مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ جب ایک اسٹیشن پر مجھے خدا حافظ کہہ کر اُتری تو بالکل اسی حلیے میں تھی جس میں ٹرین میں سوار ہوتے وقت تھی۔ وہ بالکل پُرسکون اور ٹھیک ٹھاک نظر آرہی تھی اور اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹرین میں چند اسٹیشنوں کے مسافت کے دوران اس کی مصروفیات کیا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شوٹنگ کے پہلے دن میرا سین اپنے وقت کی نہایت اچھی اداکارہ درگا کھوٹے کے ساتھ تھا جن کا میں برسوں سے زبردست مداح تھا۔ وہ اس فلم میں میری ماں بنی تھیں۔ ان سے پہلی ملاقات میں اتنا نروس تھا کہ گفتگو میں اپنے جملے مکمل نہیں کر پا رہا تھا لیکن انہوں نے

میری اتنی ہمت افزائی کی، کہ میں ان سے بات کرنے اور ان کے ساتھ کام کرنے میں پُراعتماد ہو گیا۔ میرے دانتوں کے درمیان خالی جگہ کو ڈینٹسٹ نے بھر دیا تھا لیکن اس فلنگ کی وجہ سے بعض الفاظ کی ادائیگی میں دشواری ہونے لگی تھی۔ آخر میں نے سنتوشی سے اس سلسلے میں بات کی۔ انہوں نے دانتوں کے درمیان سے وہ فلنگ نکلوا دی۔ میرے دانت اسکرین پر ویسے ہی نظر آنے لگے جیسے قدرت نے بنائے تھے۔ اس کے بعد میں مکالمے درست طریقے سے بولنے لگا۔

اپنی اس فلم ''ہم ایک ہیں'' کی شوٹنگ کے دوران میں ایک گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھا۔ وہاں ایک گوری اور ذرا گول مٹول سی لڑکی بھی رہ رہی تھی۔ اس کے اور میرے کمرے کے درمیان صرف ایک ڈائننگ ہال اور چند کمروں کا فاصلہ تھا۔ کھانے کی میز پر اکثر رات کو ہماری ملاقات ہوتی۔ کچھ دنوں میں کافی شناسائی ہو گئی جو رفتہ رفتہ دوستی میں ڈھل گئی۔

ایک روز وہ کھانے کی میز پر نظر نہ آئی تو میں نے خانساماں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ خانساماں، بیرے کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ''مس صاحب'' نے آج خاص طور پر میرے لئے کھانا بنوایا ہے۔ لیکن وہ مجھے ان کے کمرے میں جا کر، ان کے ساتھ ہی کھانا پڑے گا۔ یہ بتاتے وقت اس کے ہونٹوں پر نہایت ہلکی، مگر ذرا شریر سی مسکراہٹ تھی۔ مجھے اطلاع دے کر وہ رخصت ہو گیا۔

وہ لڑکی، جس کا نام..... فرض کر لیجئے، پنکی تھا، اپنے کمرے میں میری منتظر تھی..... اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک نہایت حسین تجربہ بھی میرا منتظر تھا۔ کھانا قریب ہی میز پر رکھا رہ گیا اور پنکی مجھے اپنے ہمراہ کسی اور ہی دنیا میں لے گئی۔ اس کے بعد تو اکثر ہی اس سے اس طرح کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور زندگی مجھے بہت خوبصورت لگنے لگی۔ ٹرین میں ملنے والی عورت نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم تیز اور تجربہ کار ہو جاؤ گے۔

پنکی کے اندر بھی گویا ہمیشہ تند و تیز اور سرکش جذبات کا ایک سمندر موجزن رہتا تھا۔ دنیا کی نظروں سے بچنے کے لئے وہ مجھے، کچھ دور پھیلے ہوئے مکئی اور گنے کے کھیتوں میں بھی بلا لیتی۔ اس کی رفاقت نے میری زندگی میں اتنے رنگ بھر دیئے تھے کہ میں گویا ہواؤں میں اُڑتا پھرتا تھا۔ پونا مجھے اپنے خوابوں کا شہر لگنے لگا تھا۔ پھر ایک روز اس نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ شادی شدہ تھی!.....

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

ہماری محبت کی کہانی کا انجام عجیب تھا

تمکین تبسم

قسط : 09

''کیا تم واقعی شادی شدہ ہو؟'' میں نے پنکی سے پوچھا۔ میرے لہجے میں دنیا جہاں کی حیرت اور بے یقینی تھی۔ ''ہاں.....'' اس نے سر جھکا کر قدرے شرمندگی سے جواب دیا لیکن پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے امید افزاء لہجے میں کہا ''مگر میرا شوہر کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ہماری شادی اب محض دکھاوے کی شادی ہے۔ ہمارا ایک دوسرے سے برائے نام تعلق ہے۔''

میں گم صم سا رہ گیا۔ مجھے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ وہ شادی شدہ ہو سکتی ہے۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''کل میری سالگرہ ہے۔ اس موقع پر وہ مجھ سے آخری بار ملنے آرہا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر اس لڑکی سے شادی کر لے گا۔ میں چاہتی ہوں، کل اس سے پہلے میں مکئی کے کھیت میں تم سے بھی ملاقات کروں۔ ہم اپنا اپنا بہترین لباس پہن کر وہاں ملیں گے۔ میری سالگرہ کے دن ہی میری شادی ہوئی تھی۔ اس لئے اسی دن میرا شوہر مجھ سے الوداعی ملاقات کرنے آرہا ہے۔ رات کو میں اس کے ساتھ ہوں گی۔ دن میں، میں تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔''

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں خوش تھا یا غمزدہ..... بہر حال میں اس کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ ہمارے درمیان مکئی کے کھیت میں ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔

دوسرے روز میں اس ملاقات کے لئے الماری میں اپنی بہترین شرٹ ڈھونڈنے لگا تو پتا چلا کہ دھوبی اس کی جگہ کوئی اور شرٹ دے گیا تھا۔ کسی اور کی شرٹ سے میری شرٹ تبدیل ہو گئی تھی۔ جو شرٹ الماری میں موجود تھی، وہ اتنی اچھی تو نہ تھی لیکن میرے ہی سائز کی تھی۔ مجبوراً مجھے وہی پہننی پڑی۔ وہ شرٹ پہن کر پہلے میں شوٹنگ کے لئے اسٹوڈیو چلا گیا۔ میں فلور پر داخل ہو رہا تھا تو تقریباً میری ہی عمر اور جسامت کا ایک نوجوان باہر آتا دکھائی دیا۔ ہم ایک دوسرے کے قریب سے گزرنے لگے تو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ''ہیلو'' کہا اور رک گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

''آپ غالباً اس فلم کے ہیرو ہیں جس کی شوٹنگ یہاں چل رہی ہے؟'' اس نے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں اس فلم میں کام تو ضرور کر رہا ہوں لیکن میں خود کو ہیرو نہیں سمجھتا۔'' میں نے انکساری سے جواب دیا۔

''لیکن آپ ہیرو لگتے ہیں۔'' اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ پھر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ''مجھے گرودت کہتے ہیں۔ میں یہاں مسٹر بیدیکر کو اسسٹ کر رہا ہوں..... اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... امید ہے آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی.....'' میں نے گرمجوشی سے کہا لیکن اس دوران میں غور سے اس کی شرٹ کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری وہی شرٹ پہنے ہوئے تھا جو میں نے دوسرے کئی کپڑوں کے ساتھ دھوبی کو دھلائی کے لئے دی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ گرودت بھی غور سے اس شرٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جو میں نے پہنی ہوئی تھی۔

آخر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا ''آپ کی شرٹ بہت اچھی ہے..... یہ آپ نے کہاں سے خریدی؟''

''پہلے آپ بتائیں، آپ نے اپنی شرٹ کہاں سے خریدی؟ یہ بھی بہت اچھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے یہ میرے دھوبی نے تحفے کے طور پر دی ہے۔'' وہ شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''عجیب بات ہے.....! میرا جواب بھی یہی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا لیکن پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ وہ بھی زور سے ہنسا..... اور پھر ہنستے ہنستے ہم دُہرے ہو گئے۔

وہ گرودت سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم ہمیشہ کے لئے گہرے دوست بن گئے۔

اسی روز جب ڈوبتے سورج کی کندنی کرنیں مکئی کے لمبے پودوں پر لرز رہی تھیں، دو محبت کرنے والے انہی پودوں کے درمیان چھپے ہوئے تھے۔ ان کے جسم پر ان کے بہترین لباس تھے لیکن وہ دنیا مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کی بانہوں میں سمٹے مکئی کے کھیت کی مٹی پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ میں اور پنکی تھے۔ ہم ایک دوسرے میں گم تھے۔

''میرا شوہر کل تک گیسٹ ہاؤس میں میرے ساتھ رہے گا.....'' آخر وہ مخمور سے لہجے میں بولی ''پھر ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ دیں گے۔ اس کے جانے کے بعد میں صرف اور صرف تمہاری ہوں گی۔ مجھے جہاں چاہے لے جانا۔''

اس کے یہ الفاظ سن کر میری روح ایک عجیب سی خوشی سے سرشار ہو گئی!

دوسرے روز میں ڈائننگ ہال میں پہنچا تو پنکی مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔ میں نے اس کے کمرے کی طرف دیکھا تو اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں کھانے کے لئے بیٹھ گیا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کھا رہا ہوں۔ میں بس پنکی کے بارے میں ہی سوچے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، پنکی عام سی شکل کے ایک قدرے موٹے سے آدمی کے ساتھ اس گاڑی سے اتر رہی تھی۔ وہ دونوں اندر آئے اور پنکی میری طرف دیکھے بغیر اسے ساتھ لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن چند لمحے بعد وہ اسے کمرے میں ہی چھوڑ کر واپس آگئی اور ڈائننگ ٹیبل پر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شدید الجھن میں ہے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں ساکت بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔ میں نے ایک بار اس کے کمرے کی طرف بھی دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ آنے والا اس کا شوہر تھا..... اور وہ اس کمرے میں موجود تھا۔ آخر کار پنکی نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی ''میرے شوہر نے مجھ سے معافی مانگ لی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میرے بجائے اس نے دوسری لڑکی کو چھوڑ دیا ہے جس کے وہ چکر میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ مجھے تم سے محبت ہے..... لیکن اب وہ واپس آگیا ہے تو میں اس کا ہاتھ جھٹکنے کی ہمت نہیں کر پا رہی ہوں.....''

پھر وہ اور بھی زیادہ اٹک اٹک کر بولی۔ ''مسئلہ صرف ہم میاں بیوی کا نہیں..... ہمارے بچے کا بھی ہے..... وہ پانچ سال کا ہے اور بورڈنگ اسکول میں داخل ہے..... اسے ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہے۔ وہ ہماری سخت کمی محسوس کرتا ہے..... مجھے لگتا ہے، اگر میں نے اپنے شوہر کو چھوڑا تو یہ اپنے بچے کے ساتھ میری بہت بڑی زیادتی ہوگی۔''

میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے گویا سُن سا ہو گیا۔ مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے تو مجھے اس کے شادی شدہ ہونے پر ہی یقین نہیں آرہا تھا کہ اب اس نے پانچ سال کے بچے کی ماں ہونے کا بھی انکشاف کر دیا تھا۔ وہ اتنی نوخیز، کم عمر اور تازہ دم نظر آتی تھی کہ اس کے ان انکشافات پر یقین کرنا شاید کسی کے لئے بھی مشکل ہوتا۔ میرے لئے تو یوں بھی زیادہ مشکل تھا کہ میں اس کے طوفان خیز جذبات سے بھی آگاہ تھا۔

''میں کیا کروں؟'' اس نے بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''اپنے ضمیر سے پوچھو.....'' میرے حلق سے بہ مشکل آواز نکلی۔ ''اس وقت تمہارے لئے تمہارے ضمیر کا مشورہ ہی سب سے اچھا ہوگا۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے بالوں نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ بھیگی ہوئی تھیں لیکن میں نے ان آنکھوں میں اس کا فیصلہ پڑھ لیا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تو میرے حلق سے بیٹھی بیٹھی سی آواز نکلی لیکن میں بہر حال اپنی بات کہنے میں کامیاب ہو گیا۔ ''میں تمہارے لئے..... تمہارے شوہر اور بچے کے لئے..... دعا گو رہوں گا..... کہ تم تینوں مل کر ایک اچھی اور خوشیوں بھری زندگی گزارو.....''

میں نے آخری بار اس کا ہاتھ چوما اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے وقت مجھے ایک کارنس پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا نظر آیا۔ میں نے گلاس میں پانی انڈیل کر دھیرے دھیرے پیا۔ اس دوران ڈائننگ ٹیبل کی طرف میری پیٹھ تھی اور مجھے کوئی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ پنکی اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ گلاس خالی کر کے میں نے نہایت آہستگی سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ پنکی واقعی جا چکی تھی..... ہمیشہ کے لئے..... ڈائننگ ہال سے بھی..... اور میری زندگی سے بھی.....!

☆.....☆.....☆

میرے اور گرودت کے خواب کافی حد تک ملتے جلتے تھے۔ وہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بن کر شاندار قسم کی بہت سی فلمیں بنانا چاہتا تھا جبکہ میں ایک بڑا اداکار اور فلم اسٹار بننا چاہتا تھا۔ ہم میں قدرِ مشترک یہی تھی کہ ہم دونوں ہی کو فلموں سے عشق تھا۔ ہم دنیا بھر کی شاہکار فلمیں اکٹھے دیکھنے جاتے اور ہم دونوں ہی کی تمنا تھی کہ دنیا میں اپنا کچھ کام اور نام چھوڑ جائیں۔ کچھ ایسا کر جائیں جس کے حوالے سے دنیا ہمیں یاد کرے اور ہمارے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی ہمارے تذکرے ہوتے رہیں۔

ہم پونا کی گلیوں میں کبھی پیدل اور کبھی سائیکلوں پر گھومتے۔ دکانوں پر ایسی نئی اور پرانی کتابیں اور رسالے تلاش کرتے جنہیں پڑھ کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آزمانے کے لئے ہمارا دل اور بھی زیادہ بے چین ہو جاتا۔ ہم تانگے میں بھی گھومتے اور ایسے ریسٹورنٹس میں بیٹھتے جہاں زیادہ تر ایسے ہی لوگ بیٹھتے تھے جن کے دلوں میں ہماری طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آزمانے کا شوق مچل رہا ہوتا تھا۔ ہم اکثر ساتھ رہتے۔ حتیٰ کہ ہم دونوں نے بیک وقت ایک ہی ڈانسر سے ہلکا پھلکا عشق جھاڑنے کی بھی کوشش کی۔ اس ڈانسر پر ایک گانا اور ڈانس پکچرائز کرنے کے لئے اسے بمبئی سے بلایا گیا تھا۔

میں اور گرودت جب بمبئی میں ہوتے تب بھی کم و بیش ہمارے یہی معمولات ہوتے۔ پالی ہل اس زمانے میں گنجان علاقہ نہیں تھا۔ وہاں خالی اور خوبصورت مقامات کی کمی نہیں تھی۔ گرودت ان جگہوں پر مجھے ماڈل بنا کر اپنے کیمرے سے میری تصویریں کھینچتا۔ اس کا گھر مٹونگا کے علاقے میں تھا۔ ہم بس میں بیٹھ کر وہاں جاتے۔ اس کی والدہ جو ایک خوبصورت خاتون تھیں، ہمارے لئے گرم گرم کھانا تیار کرتیں۔ کھانا کھاتے وقت ہم انہیں اپنی دن بھر کی مصروفیات اور آوارہ گردی کا احوال سنایا کرتے۔

ایک روز گرودت نے قسم کھانے کے سے انداز میں گہری سنجیدگی سے کہا ''دیو..... اگر میں ڈائریکٹر بن گیا تو میری فلم کے ہیرو تم ہو گے۔''

میں نے بھی فوراً اسی کے انداز میں کہا ''اور اگر میں نے کوئی فلم پروڈیوس کی تو تم اس کے ڈائریکٹر ہو گے۔''

ایک روز ہم لوکل ٹرین میں سفر کر رہے تھے، گاڑی ایک اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو گرودت پلیٹ فارم کی طرف دیکھ کر جوش سے بولا۔ ''ارے..... وہ دیکھو..... پوسٹر پر تمہاری تصویر.....''

اس سے پہلے کہ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا، ٹرین آگے نکل چکی تھی۔ میں پوسٹر نہیں دیکھ سکا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ''ہم ایک ہیں'' ریلیز ہونے والی تھی اور ملک بھر میں اس کے پوسٹر لگنا شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی تک میں نے پوسٹر دیکھا نہیں تھا۔ اب بھی میں پلیٹ فارم پر لگا ہوا پوسٹر نہیں دیکھ سکا تھا۔ چنانچہ ہم ٹرین میں جہاں جا رہے تھے، وہاں نہیں اترے اور اسی میں بیٹھے بیٹھے واپس آگئے۔

پلیٹ فارم پر اتر کر ہم پوسٹر تک پہنچے جس پر میری بڑی سی تصویر بلندی سے جھانک کر گویا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ چند آدمی اور بھی وہاں کھڑے قدرے تجسس سے پوسٹر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوشگوار تاثرات تھے۔ میرے لئے پہلی بار ایک فلمی پوسٹر پر اپنی تصویر دیکھنا ایک نہایت سنسنی خیز تجربہ تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے گرودت کی طرف دیکھا تو وہ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا ''گڈ.....''

دوسرے آدمی آگے بڑھ گئے تو دو لڑکیاں پوسٹر دیکھنے کے لئے رک گئیں۔ گرودت نے میری تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان میں سے ایک لڑکی سے پوچھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے فلم کا ہیرو؟''

سوال ایک لڑکی سے کیا گیا تھا لیکن ان دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ ''بہت اچھا!''

''آپ اس سے ملاقات کرنا پسند کریں گی؟'' گرودت نے ان سے پوچھا۔ لڑکیوں نے ابھی تک میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

''کیا واقعی ملاقات ہو سکتی ہے؟'' ان میں سے ایک لڑکی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''میں ابھی آپ کی اس سے ملاقات کرا دیتا ہوں لیکن آپ جا کر اس کی فلم بھی ضرور دیکھئے گا۔'' گرودت نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ پھر میرا بازو پکڑ کر کھینچا اور مجھے لڑکیوں کے سامنے کر دیا۔

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر پوسٹر کی طرف دیکھا۔ دو تین مرتبہ اسی طرح باری باری دونوں کو دیکھنے کے بعد ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہیں گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ جس فلم کا پوسٹر دیکھنے کے لئے وہ رک گئی تھیں، اس کا ہیرو ان کے سامنے ریلوے پلیٹ فارم پر ہی کھڑا تھا!

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

قسمت مہربان ہو تو انسان کی خامیاں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں

تمکین تبسم

قسط : 10

دونوں لڑکیاں شرمیلے سے انداز میں میری طرف دیکھ کر ایک دوسری سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔ اس دوران ٹرین اگلے اسٹیشن کی طرف روانہ ہونے کے لئے رینگنے لگی تھی۔ میں نے گرودت کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ کر ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین کی کھڑکی سے میں نے دیکھا، لڑکیاں اب بھی یوں میری طرف دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے ہاتھ ہلایا تو وہ بھی سحر زدہ سے انداز میں ہاتھ ہلانے لگیں۔ دھیرے دھیرے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ ''ہم ایک ہیں'' ریلیز ہو چکی تھی اور اس نے اوسط درجے سے کچھ بہتر بزنس کیا تھا۔ میرے حق میں سب سے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ فلمی شائقین نے مجھے پسند کر لیا تھا..... اور فلمی شائقین جب کسی کو پسند کر لیتے ہیں تو پھر اس کی ظاہری شخصیت کی خامیاں اور نقائص نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میرے دانتوں میں ایک دو جگہ جو معمولی سا چھدرا پن تھا اور جسے میری فلم کے ڈائریکٹر ایک خامی سمجھ رہے تھے، اس کے بارے میں خواتین نے تبصرہ کیا کہ اس کی وجہ سے میں کیوٹ لگتا ہوں۔ جب قسمت آپ پر مہربان ہوتی ہے تو آپ کی خامیاں بھی خوبیاں بن جاتی ہیں۔ مجھے خود اپنی پہلی فلم میں اپنی پرفارمنس ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میں صاف طور پر اناڑی اور ناپختہ لگ رہا تھا لیکن بس..... اوپر والے کی مہربانی تھی، مجھے مسترد نہیں کیا گیا۔ میں فلاپ نہیں ہوا۔

مجھے فلموں کی آفرز ملنے لگیں لیکن میں نے نووارد ہونے کے باوجود فلمیں قبول کرنے کے معاملے میں بے صبری نہیں دکھائی اور ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے یہ دیکھنے لگا کہ اسکرپٹ کیسا ہے اور اس میں میرا کردار کیا ہے۔ تاہم ''پربھات اسٹوڈیو'' سے چونکہ میرا معاہدہ تھا، اس لئے مجھے ان کی اگلی فلم ''آگے بڑھو'' کسی اعتراض کے بغیر سائن کرنی پڑی۔ اس میں میرے مقابل مجھ سے سینئر اور بہت مشہور اداکارہ خورشید ہیروئن تھیں۔ میں نے کالج کے زمانے میں، لاہور میں ان کی فلم ''تان سین'' دیکھی تھی

جس میں ہیرو کے۔ ایل سہگل تھے۔ وہ اپنے وقت کی ایک نہایت کامیاب نغماتی فلم تھی۔ مجھے جس وقت خورشید کے مقابل کاسٹ کیا گیا، کے۔ ایل سہگل کا انتقال ہو چکا تھا لیکن خورشید بدستور سپر اسٹار تھیں۔

میری فلم ''ہم ایک ہیں'' تمام مذاہب اور قوموں کے درمیان یک جہتی کے موضوع پر تھی لیکن ملک میں اس وقت نفرت کی آگ بھڑکنا شروع ہو چکی تھی۔ آزادی کی جدوجہد کی وجہ سے ملک بھر میں جو بے امنی پھیلی ہوئی تھی، وہ تو اپنی جگہ تھی لیکن ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے نے لوگوں کے درمیان نفرت کی خلیج پیدا کر دی تھی۔ جب اس منصوبے پر عمل کا وقت آیا اور ملک تقسیم ہوا تو وہ ہولناک خونریزی ہوئی اور ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ انسانیت منہ چھپا کر جنگلوں کی طرف نکل گئی۔ انسان نے انسان کے ساتھ جو کچھ کیا، ان بھیانک یادوں کے زخم آج تک مندمل نہیں ہوئے۔

آزادی کی رات پنڈت جواہر لال نہرو کی، عمدہ انگریزی میں تقریر سننے کے بعد دوسری صبح میں حسب معمول چرچ گیٹ اسٹیشن سے لوکل ٹرین میں سوار ہوا تو وہ نئے بھارتی پرچموں سے سجی ہوئی تھی۔ میں ٹرین میں بیٹھا تو مجھے فرنٹیئر میل یاد آئی جو مجھے لاہور سے بمبئی لائی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک روز فرنٹیئر میل دوسرے ملک میں رہ جائے گی اور میں دوسرے ملک میں بیٹھا ہوں گا۔ میرا شہر گورداسپور، جہاں میں پیدا ہوا تھا، ایک سرحدی شہر بن جائے گا اور سرحد کے دونوں طرف دونوں ملکوں کی فوجیں ہمیشہ ایک دوسرے پر بندوقیں تان کر بیٹھی رہیں گی۔

بہرحال..... وقت تو گزرتا ہی رہتا ہے۔ بھیانک یادوں کے زخم بھریں یا نہ بھریں لیکن انسان کی روزمرہ مصروفیات جاری رہتی ہیں۔ میں بھی اپنی جدوجہد میں الجھا ہوا تھا۔ ایک روز میں لوکل ٹرین میں سوار ہوا تو عقب سے کسی نے مجھے پکارا۔ آواز کمپارٹمنٹ کے اندر سے ہی آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ شاہد لطیف تھے۔ وہ اردو کے معروف رائٹر تھے۔ ان کی اہلیہ عصمت چغتائی بھی اردو کی مشہور مصنفہ تھیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اس وقت لوکل ٹرین میں ایک لمبی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

میں نے قریب پہنچ کر ان سے سلام دعا کی جس کے بعد شاہد لطیف نے پوچھا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''لوکل ٹرین میں سفر کر رہا ہوں۔'' میں نے معصومیت سے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے..... کام وغیرہ کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے میرے مذاق پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

''آپ کو معلوم ہے، فلمیں ہی کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کل گیارہ بجے بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو آ جاؤ۔'' وہ بولے۔

''کوئی خاص بات؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''بس..... تم آ جاؤ۔'' انہوں نے زور دے کر کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹرین میں مجھے دیکھتے ہی ان کے ذہن میں کوئی خاص خیال آیا تھا لیکن فی الحال وہ کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔

''بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو'' بمبئی کے مضافاتی علاقے ملاڈ میں تھا۔ ملاڈ کے اسٹیشن پر اتر کر تانگے میں بیٹھ کر وہاں جانا پڑتا تھا۔ اس اسٹوڈیو نے اس زمانے کی سب سے زیادہ ہٹ فلمیں بنائی تھیں جن میں سے زیادہ تر کے ہیرو اشوک کمار تھے۔

دوسرے روز میں نے اسٹوڈیو میں شاہد لطیف سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے کینٹین میں چائے پلائی اور وہیں سے کسی کو فون کر کے پوچھا۔ ''کیا میں اسے آپ کے پاس لے آؤں؟''

دوسری طرف سے غالباً اجازت مل گئی، اس لئے وہ مجھے ساتھ لے چلے لیکن میرے پوچھنے کے باوجود یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھے کس کے پاس لے جا رہے تھے۔ وہ سسپنس قائم رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایک اچھے سے آفس کے دروازے پر رک کر انہوں نے دستک دی تو اندر سے ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ ''آ جاؤ۔''

شاہد لطیف نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا لیکن خود باہر ہی رہے۔ میں ایک قدم آگے بڑھا تو سامنے ہی اس شخصیت کو بیٹھے دیکھا جو میری آئیڈیل تھی..... اور وہ تھے اشوک کمار.....!

میں لاہور میں ان کی فلم کے پریمیئر کے موقع پر ان کی آمد کی خبر سن کر ان سے ملاقات کا اشتیاق دل میں لئے سینما ہاؤس گیا تھا لیکن مجھے اور میرے دوستوں کو ٹکٹ ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس وقت اشوک کمار سے ملاقات کی حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی تھی لیکن آج میں اچانک ان سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ ان کے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا جو ایک طرح سے ان کی پہچان بن گیا تھا۔

''سر..... میرا دل نہیں چاہ رہا کہ میں آپ کو سر کہوں..... کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں آپ کو بہت قریب سے جانتا ہوں.....'' میں نے سحر زدہ سے لہجے میں کہا۔

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا، پھر اپنے مخصوص انداز میں ہی سگریٹ کا کش لے کر مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں مجھ کو 'سر' کہنے کی ضرورت نہیں.....'' ان کا لہجہ بالکل دوستانہ تھا۔

میں بیٹھ چکا تو انہوں نے بلا تمہید پوچھا۔ ''میری فلم کرو گے؟''

میں دم بہ خود ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے اپنی فلم میں کام کرنے کی دعوت دیں گے۔ ابھی میں کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ پیچھے سے شاہد لطیف کی آواز آئی۔ ''میں اس فلم کا ڈائریکٹر ہوں۔ اشوک صاحب پروڈیوسر ہیں۔'' شاہد لطیف بھی کمرے میں آ چکے تھے۔

اشوک صاحب نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلنے کے بعد نیا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبانے سے پہلے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''سگریٹ پیتے ہو؟''

''ابھی تک تو نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔

انہوں نے اپنی سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا اور پوچھا۔ ''پیسے کتنے لو گے؟''

''مجھے شرمندہ نہ کریں دادا منی.....!'' میں نے سنا تھا کہ فلم انڈسٹری میں انہیں اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ ابھی میں نے فلم کے لئے ہامی نہیں بھری تھی اور انہوں نے معاوضے کا پوچھ لیا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی فلم میں مجھ سے کام لے کر مجھے ایک اچھا اداکار بنا دیں۔ بس یہی میرا معاوضہ ہو گا۔''

اشوک صاحب کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ انہیں میرا جواب سن کر خوشی ہوئی تھی۔ شاہد لطیف بولے۔ ''کنٹریکٹ تیار ہے۔ تمہیں بس دستخط کرنے ہیں۔''

وہ میری پہلی سپرہٹ فلم ''ضدی'' کا معاہدہ تھا جس نے مجھے اسٹار بنا دیا۔ اس فلم کی کہانی عصمت چغتائی کے ناول سے لی گئی تھی اور انہی کے شوہر اسے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ میں جب معاہدہ سائن کر کے اپنے دل میں اشوک کمار اور شاہد لطیف کے لئے بے پناہ ممنونیت کے جذبات لئے کمرے سے باہر آیا تو میں نے اچھی طرح گھوم پھر کر اس اسٹوڈیو کو دیکھا جس میں اب مجھے کام کرنا تھا۔

اس اسٹوڈیو میں، میں نے ''ضدی'' میں کامنی کوشل کے ساتھ کام کیا۔ پھر ''تماشا'' میں اپنے وقت کی بے مثل اداکارہ مینا کماری کے ساتھ کام کیا۔ بعد میں ''بادبان'' میں بھی وہی میری ہیروئن تھی۔ میں جب کنٹریکٹ کا کاغذ جیب میں ڈالے اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچا تو ناصر خان اندر آتے دکھائی دیئے۔ وہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ بھی فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ مجھ سے پہلے انہیں فلمستان اسٹوڈیو کی ایک فلم میں کام کرنے کا موقع مل چکا تھا۔

''تم یہاں بمبئی ٹاکیز میں کیا کر رہے ہو دیو آنند؟'' انہوں نے پوچھا۔ وہ مجھے اس اسٹوڈیو میں دیکھ کر حیران نظر آ رہے تھے۔

''میں نے کچھ ہی دیر پہلے یہاں ایک فلم سائن کی ہے۔'' میں نے مسرور لہجے میں بتایا۔

''کون سی فلم؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ضدی.....'' میں نے جیب سے کنٹریکٹ کا کاغذ نکال کر لہراتے ہوئے کہا۔ ناصر خان کا چہرہ یکدم اتر سا گیا لیکن پھر شاید انہوں نے خود کو سنبھال کر مجھے مبارکباد دی اور گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گئے۔ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ ''ضدی'' کے لئے ان کا نام بھی زیر غور تھا اور وہ اس وقت اسی سلسلے میں اشوک کمار اور شاہد لطیف سے ملنے آ رہے تھے جب گیٹ پر مجھ سے ملاقات ہو گئی۔

ناصر خان اور میں، فلموں میں موقع ملنے سے بھی کافی پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ہم دونوں پالی ہل سے باندرہ آنے کے لئے بس کے انتظار میں اسٹاپ پر قطار میں کھڑے تھے۔ وہ ہمیشہ بڑی عمدہ پینٹ شرٹ میں ہوتے۔ سر پہ فیلٹ ہیٹ ہوتا۔ میں نے انہیں کئی بار اپنی ہی طرح بس کے انتظار میں کھڑے دیکھا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کسی اور طرف دیکھنے لگ جاتے تھے۔ وہ اتنے گورے چٹے تھے کہ ابتداء میں مجھے یہ گمان بھی ہوا کہ شاید وہ کوئی سفید فام غیر ملکی ہیں۔

پھر ان سے تعارف اور بات چیت ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو پنجابی بھی کہتے تھے اور پٹھان بھی۔ وہ پالی ہل پر بہت شروع میں رہائش اختیار کرنے والے لوگوں میں سے تھے۔ ہماری کئی سال دوستی رہی۔ پھر وہ ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر کے، پاکستان جا کر غائب اور گمنام ہو گئے۔ ان کے والد پشاور کے تھے اور بمبئی کی کرافورڈ مارکیٹ میں پھلوں کے تاجر تھے۔ ہم نے سمندر کے کنارے دیوار پر بیٹھ کر بارہا گپ شپ کرتے ہوئے، جاگتی آنکھوں سے نہ جانے کتنے خواب دیکھے۔ ہم دونوں ہی فلمی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ایک روز میں انہیں چھوڑنے ان کے گھر تک گیا تو دروازے پر سفید پتلون قمیض میں، میں نے ایک نہایت ہی دلکش شخصیت کے مالک کو کھڑے دیکھا۔ ناصر خان نے اس خوبرو شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کے بڑے بھائی یوسف خان تھے۔ وہ ان دنوں بمبئی ٹاکیز کے ساتھ اپنی پہلی فلم کر رہے تھے۔ یہ وہی یوسف خان تھے جنہیں دنیا دلیپ کمار کے نام سے جانتی ہے۔ انڈین سینما اسکرین کے سب سے بڑے اداکار..... فلم نگر کے سب سے بڑے جادوگر.....!

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

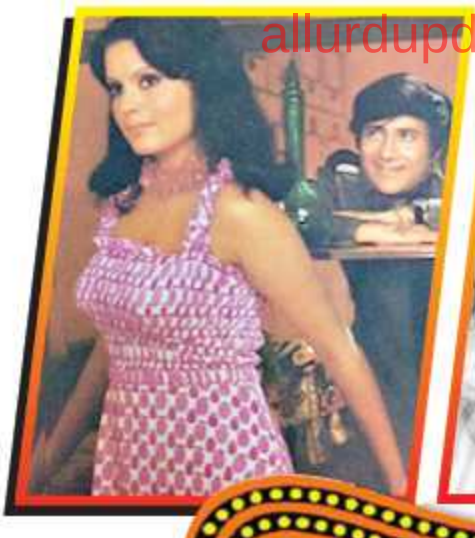

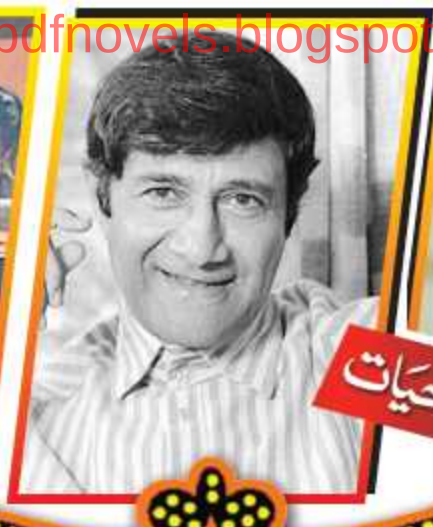

دیو آنند کی داستانِ حیات

کشور کمار نے گانا کسی سے سیکھا نہیں تھا

کشور کمار کے ساتھ

تمکین تبسم

قسط : 11

فلم "ضدی" میرے کیریئر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے مجھے ایک باقاعدہ اداکار تسلیم کرایا۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد بطور ہیرو میرا فلم انڈسٹری میں ایک قابل ذکر مقام متعین ہوگیا۔ اسی فلم کی وجہ سے میرے، اشوک کمار اور ان کے چھوٹے بھائی کشور کمار سے گہرے اور قریبی مراسم قائم ہوئے۔ کشور کمار انہی دنوں اپنے آبائی قصبے کھنڈوا سے بمبئی پہنچے تھے۔ وہ فلمی دنیا میں کُرتا پاجامہ پہن کر آئے تھے اور ایک سیدھے سادے دیہاتی دکھائی دیتے تھے۔ اگلے چند برسوں میں انہوں نے اپنی خوبصورت آواز سے نہ صرف پوری دنیا میں دھوم مچادی بلکہ فلمی ہیرو بن کر رنگا رنگ کردار بھی ادا کیے۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا پہلا گانا "ضدی" میں مجھ پر پکچرائز ہوا تھا جو دراصل اس دور کے مشہور شاعر پریم دھون کی غزل تھی جس کا مطلع تھا:

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے

یہ گانا ہٹ ہوگیا اور فلمی ناظرین نے کشور کمار کی آواز کو اسکرین پر میرے لیے موزوں ترین سمجھنا شروع کردیا۔

اس کے بعد کشور کمار جب بھی میرے لیے گانا گاتے، وہ تصور ہی تصور میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ میں اس گانے کو کس طرح پکچرائز کراؤں گا۔ وہ اپنی آواز کو میرے متوقع انداز اور تاثرات سے ہم آہنگ کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ اسی کوشش میں انہوں نے طرح طرح کی آوازیں اور تانیں اپنے گانوں میں متعارف کرائیں۔ جب وہ ایک اسٹار ایکٹر اور سنگر بن گئے تو انہوں نے اپنی آواز تقریباً میرے لیے ہی وقف کردی۔ پھر انہوں نے دوسرے اداکاروں کے لیے بہت ہی کم گایا۔

باہر کی دنیا میں میرا اور کشور کمار کا جو بھی امیج رہا ہو لیکن حقیقی زندگی میں..... خاص طور پر دوستی کے معاملے میں ہم دونوں بچوں کی طرح تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ گلوکاری کے میدان میں اتنا بڑا نام رکھنے والے کشور کمار نے گانا باقاعدہ طور پر کسی سے سیکھا نہیں تھا اور نہ ہی موسیقی کی کوئی تربیت حاصل کی تھی۔

انہوں نے خود اپنی فلمیں ڈائرکٹ بھی کیں اور ڈائرکشن کی بھی انہوں نے کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ وہ کسی ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ نہیں رہے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ کتنے باصلاحیت انسان تھے لیکن افسوس..... کہ ایک روز بالکل اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ میرے ہی لیے اس روز فلم "سچے کا بول بالا" کا گانا ریکارڈ کروا رہے تھے جب انہوں نے پیغام بھیج کر مجھے ریکارڈنگ بوتھ میں بلوایا اور کہا "دیو بھائی! میں اپنے کنسرٹ کے لیے امریکا جارہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس بار آپ بھی میرے ساتھ چلیں اور اسٹیج پر میرے بارے میں تعارفی تقریر آپ کریں۔ امریکا میں بے شمار دوسرے لوگوں کی خواہش بھی یہی ہے۔"

"آپ جیسے دوست اور بھائی کے لیے میں ضرور چلوں گا کشور! بس مجھے بتا دینا کہ کب چلنا ہے۔" میں نے بلا تامل، خلوص نیت سے کہا۔

میں اسی وقت کشور کے ساتھ امریکا جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگیا تھا لیکن قدرت کے ارادے کچھ اور تھے۔ اوپر والے نے ان کا اور میرا پروگرام بالکل بدل دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے میرے لیے جو گانا ریکارڈ کرایا ہے، وہ ان کا آخری گانا ہے اور انہیں کنسرٹ کے لیے امریکا جانا نصیب نہیں ہوگا۔ مجھے وہ دن بھی بہت اچھی طرح یاد ہے جب میں ان کے بے جان جسم کے پاس ان کے بیڈ روم میں تنہا کھڑا تھا اور میرے ذہن میں وہ سارے گانے گونج رہے تھے جو انہوں نے میرے لیے گائے تھے۔

پھر مجھ میں وہاں مزید کھڑے رہنے کی تاب نہ رہی۔ میں دوڑتا ہوا اس کمرے سے نکلا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ پھر جو میں پھوٹ پھوٹ کر رویا ہوں تو میرے آنسو تھمنے میں نہ آئے۔ میں روتا ہوا ہی وہاں سے گاڑی چلا کر گھر آیا اور اپنے بیڈ روم میں ڈھیر ہوکر نہ جانے کب تک روتا رہا۔ میری فلم "منیم جی" میں مجھ پر پکچرائز ہونے والا یہ گانا کشور نے شاید اسی موقعے کے لیے گایا تھا:

جیون کے سفر میں راہی، ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو

☆.....☆.....☆

فلم "ضدی" نے مجھے دلیپ کمار کے قریب ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے اکٹھے ہی لوکل ٹرین میں بیٹھ کر اسٹوڈیو جاتے۔ وہ "شہید" کی شوٹنگ کے لیے فلمستان اسٹوڈیو جاتے اور گڑگاؤں کے اسٹیشن پر اترتے جبکہ میں آگے ملاڈ تک جاتا۔ راستے میں ہم اپنی دلچسپی کے موضوعات پر خوب باتیں کرتے، جن میں ظاہر ہے، فلم کا موضوع ہی سرفہرست ہوتا۔ لوکل ٹرین کے روزانہ کے اس سفر نے ہمیں ایک دوسرے کا قریبی دوست بنا دیا۔

اسی زمانے میں مجھے ثریا کے ساتھ پہلی فلم سائن کرنے کا موقع ملا۔ گلوکارہ اور اداکارہ ثریا اس زمانے میں اپنے عروج پر تھی جبکہ میں ابھی نیا ہی تھا۔ اسی فلم کے ایڈوانس سے میں نے اپنی زندگی کی پہلی کار خریدی۔ وہ "بل مین" کا ایک چھوٹا ماڈل تھا۔ کار خریدنے کے لیے فلم کے پروڈیوسر پرتاپ رانا میرے ساتھ شوروم گئے جو چوپاٹی کے علاقے میں واقع تھا۔ پرتاپ رانا اس سے پہلے مجھے کار چلانا بھی سکھاتے رہے تھے۔ تاہم اس روز کار، شوروم سے وہی لے کر نکلے۔ میں ان کے برابر بیٹھا تھا اور وہ مجھے اس گاڑی کے گیئرز وغیرہ کے بارے میں سمجھا رہے تھے۔

سڑک پر کچھ دور آکر انہوں نے گاڑی میرے حوالے کردی اور خود برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ پرتاپ رانا نے میری کافی تربیت کردی ہے اور میں ڈرائیونگ سیکھ چکا ہوں لیکن جب میں نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ اس گھوڑے کی طرح ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی جس کی پیٹھ پر کسی نے زور سے چابک رسید کردیا ہو۔ اس کے بعد کافی حد تک ویسا ہی سین ہوگیا جیسا آپ نے بہت سی فلموں میں دیکھا ہوگا۔ فلموں میں دیکھنے کی حد تک وہ سین مزاحیہ لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی۔

کار کبھی دائیں لہراتی، کبھی بائیں..... میں اس کی رفتار کم کرنے کی سوچتا تو رفتار اور تیز ہوجاتی۔ میں نے ایک پھل والے کا خوانچہ الٹا، ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، بہت سے پیدل چلنے والوں نے بروقت اچھل کود کرکے اپنے آپ کو میری گاڑی تلے کچلے جانے سے بچایا۔ خوفزدہ ہوکر میں مسلسل ہارن بجائے جارہا تھا۔ چوک پر کھڑا ٹریفک کانسٹیبل بھی میری زد میں آتے آتے بچا۔ وہ میری گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کے لیے چشمہ ناک پر ٹکانے کی کوشش ہی کرتا رہ گیا اور میں آگے نکلتا چلا گیا۔

میرا خیال ہے مجھے اس روز کوئی حادثہ پیش نہ آنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں سڑکوں پر آج جیسا بھیانک ٹریفک نہیں تھا اور سڑکیں کشادہ معلوم ہوتی تھیں۔ آج جب میں اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہوں (2005ء) اگر اس زمانے میں، میں کسی بڑی سڑک پر اس طرح گاڑی لے کر نکلتا تو یقیناً اسی روز آنجہانی ہوچکا ہوتا اور آپ میری یہ آپ بیتی نہ پڑھ رہے ہوتے۔

خیر..... کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد رفتہ رفتہ گاڑی میرے قابو میں آگئی اور میں ٹھیک طریقے سے گاڑی چلانے لگا۔ پھر میں نے گردن گھما کر پرتاپ رانا کی طرف دیکھا۔ اس بے چارے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں لیکن گاڑی صحیح طرح چلتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور ہم دونوں بے اختیار قہقہے لگانے لگے۔

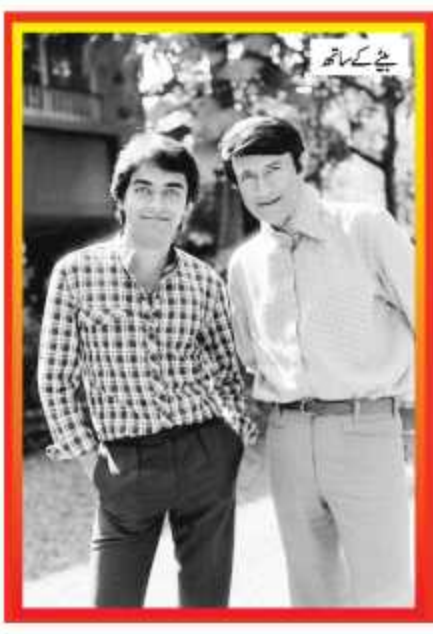

بیٹے کے ساتھ

میں نے پرتاپ رانا کو اس کے گھر اتارا لیکن میرا خود اپنے گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی زندگی کی پہلی ذاتی کار کو طوفانی رفتار سے دوڑاتے ہوئے افق تک پہنچ جاؤں۔ میں ہائی وے کی طرف نکل گیا لیکن اس پر بھی میں اپنی مطلوبہ رفتار سے گاڑی نہیں دوڑا سکتا تھا کیونکہ اس پر کہیں بیل گاڑیاں اور کہیں مویشی بھی چل رہے تھے۔ میں ان کے درمیان لہراتا، حتی الامکان تیزی سے گاڑی چلاتا میلوں دور نکل گیا۔

آخر میں نے ایک قدرے سنسان مقام پر گاڑی روکی اور باہر نکل کر اس سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے دنیا کو فتح کرلیا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں، تب بھی یہ احساس باقی رہا کہ سنہری کرنیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ اچانک مجھے وہ شربت والا یاد آگیا جس کی دکان امرتسر میں گولڈن ٹمپل کے سامنے تھی۔

میں اور میرا دوست لڑکپن میں جب شربت پینے اس کی دکان پر رُکے تھے تو اس نے غور سے میری طرف دیکھ کر کہا تھا "تم ایک روز بڑے آدمی بنو گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس کی پیشگوئی پوری ہونے کا زمانہ شروع ہوچکا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اگر وہ شخص شربت فروش کے بجائے نجومی ہوتا تو شاید لاکھوں کماتا۔

دوسرے روز میں اپنی نئی کار میں بیٹھ کر اسٹوڈیو کی طرف روانہ ہوا تو اپنے آپ کو بھی ایک نیا انسان محسوس کررہا تھا۔ میں گویا کار میں نہیں، بلکہ ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا اسٹوڈیو تک پہنچا۔ عجیب اتفاق تھا کہ اس روز اسٹوڈیو کا گیٹ بھی پورا کھلا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی کی رفتار کم نہیں کرنی پڑی اور میں اسے خاصی تیز رفتاری سے ہی اندر لے گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اندر کئی افراد نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے اور میری گاڑی کو دیکھا تھا۔

کمپاؤنڈ میں اشوک کمار عرف دادا منی کی گاڑی اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی عین اس کے قریب لے جاکر روکی اور فخریہ انداز میں نیچے اترا۔ وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ کسی نے بہ آواز بلند پوچھا "دیو بھائی! آپ نے کار خرید لی؟"

"ہاں....." میں نے فخر سے کہا "بالکل نئی ہے..... اور آج میں گھر سے ہی شوٹنگ کے لیے تیار ہوکر آیا ہوں۔ سیدھا سیٹ پر جاؤں گا۔"

"لیکن آج تو کوئی شوٹنگ نہیں ہورہی۔ آج تو چھٹی ہے۔" کسی نے مجھے مطلع کیا۔

"مگر کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں؟ پوچھنے والے کے لہجے میں مجھ سے زیادہ حیرت تھی۔

"کیا معلوم نہیں؟ بھئی پہیلیاں مت بجھواؤ..... صاف صاف بتاؤ۔" میں نے ذرا غصے سے کہا۔

"آج کسی نے گاندھی جی کو قتل کردیا ہے۔ ساری شوٹنگ کینسل ہوگئی ہیں۔" کسی نے تاسف زدہ لہجے میں مجھے اطلاع دی۔

مجھے یوں لگا جیسے میں اونچی ہواؤں میں اُڑتا ہوا ایک پرندہ تھا لیکن اچانک مجھے کوئی گولی آن لگی تھی اور میں پٹ سے نیچے آن گرا تھا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

ثریا سے میرے عشق کے چرچے ہر زبان پر تھے

تمکین تبسم

قسط : 12

زندگی بھر عدم تشدد کا پرچار کرنے والے گاندھی جی کو عین سامنے سے تین گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تو پورے ملک کی فضا سوگوار ہوگئی۔ ان کے چاہنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ لوگ انہیں دیوتاؤں کی طرح پوجتے تھے۔ ان کے قتل پر بعض لوگوں کی حالت دیکھ کر یہ گماں ہوتا تھا کہ شاید وہ صدمے کی شدت سے پاگل ہوگئے ہوں۔ المیہ در المیہ یہ تھا کہ انڈیا کو آزادی مل جانے کے بعد گاندھی جی کو قتل کیا گیا تھا۔ بہرحال..... قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز اور سانحات آتے رہتے ہیں۔ جلد یا بہ دیر زندگی معمول پر آ ہی جاتی ہے اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس سانحے نے بھی قوم کی زندگی میں جو ہلچل برپا کی تھی وہ رفتہ رفتہ معدوم ہوگئی اور دھیرے دھیرے سب دوبارہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگئے۔

میں بھی اس واقعے کے اثرات سے سنبھلنے کے بعد دوبارہ فلموں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ جب مجھے ثریا کے مقابل کاسٹ کیا گیا تو وہ گویا فلمی دنیا پر راج کر رہی تھی۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ وہ ایک حسین اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین گلوکارہ بھی تھی۔ اس طرح کی دوسری اداکارہ صرف نور جہاں تھی لیکن وہ ہجرت کر کے پاکستان جا چکی تھی اور وہاں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔

مجھے جس روز ثریا کے مقابل کیمرے کا سامنا کرنا تھا، مجھے اعتراف ہے کہ اس روز میں تھوڑا سا نروس تھا۔ میں ثریا کی آمد سے پہلے سیٹ پر موجود تھا۔ اس روز ہمیں جو سین شوٹ کرانا تھا، اس میں مجھے پیانو بھی بجانا تھا جو سیٹ پر موجود تھا۔ میں ثریا کی آمد سے پہلے مضطربانہ انداز میں اس پر انگلیاں چلا کر اس سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے لوگوں نے بتایا تھا کہ ثریا کو شاذ و نادر ہی کسی سین کے لیے ریہرسل کی ضرورت پڑتی تھی۔ زیادہ تو وہ ریہرسل کے بغیر ہی سین شوٹ کرا دیتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اس کے سامنے نیا اور اناڑی نظر نہ آؤں۔

جب ثریا سیٹ پر پہنچی تو سب لوگ اس کے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ میں پیانو کے اسٹول پر بیٹھا ذرا دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کے گرد واقعی ایک انجانی سی کشش کا غیر مرئی ہالہ تھا۔ وہ ایک چھوٹے موٹے جلوس کے ساتھ سیٹ پر پہنچی تھی۔ اس کی نانی، اس کا ماموں، دو خادمائیں، ایک میک اپ مین اور دو تین دوسرے افراد اس کے ساتھ تھے۔ اس کی نانی کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور وہ ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس سگریٹ کا کش لے رہی تھی۔

اس کے ماموں نے ایک ہاتھ میں مہنگے برانڈ کی سگریٹوں کا دھات کا ڈبہ پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں دو تھرموس تھے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان تھرموسوں میں سے ایک میں ثریا کے لیے پھلوں کا تازہ جوس اور دوسرے میں گرم گرم چائے ہوتی تھی۔ اس کا ہر جگہ شوٹنگ کے لیے پہنچنے کا یہی انداز تھا اور کم و بیش اتنے ہی افراد ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اوپر لکڑی کے تختوں اور چوڑی آہنی پٹیوں پر چڑھے ہوئے لائٹ مین جو بڑی بڑی لائٹوں کے زاویے درست کر رہے تھے، وہ بھی بڑی دلچسپی سے ثریا کی آمد کا ''نظارہ'' کر رہے تھے۔ ایک لائٹ مین کو شاید بلندی پر کسی خاص زاویے سے ثریا کو دیکھتے ہوئے کوئی ایسا نظارہ دکھائی دیا کہ اس نے فوراً مضطربانہ انداز میں بیڑی سلگا لی۔

ڈائریکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے نئے ہیرو سے ملو ثریا!''

وہ میری طرف متوجہ ہوئی تو میں اسٹول کو گھماتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ذرا اسٹائل سے گردن کو ہلکا سا خم دے کر بولا۔ ''سب مجھے یہاں دیو کہتے ہیں۔ آپ کیا کہنا پسند کریں گی؟''

''ظاہر ہے، میں بھی دیو ہی کہوں گی۔'' وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ میں نے چند لمحوں میں ہی محسوس کر لیا کہ وہ ایک خوش مزاج عورت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنستی تھی۔ اس احساس سے میری ہلکی سی گھبراہٹ اور اضطراب دور ہوگیا۔ میں نے خود کو پُرسکون اور پُراعتماد محسوس کیا۔ میرے دل کو فوراً یقین ہوگیا کہ ثریا کے ساتھ کام کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

چند لمحے سین کے بارے میں بات کرنے کے بعد لوگ ذرا اِدھر اُدھر ہوئے تو میں نے اپنی دانست میں اپنی بہترین مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے ثریا کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ذرا تجسس سے بولی۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''آپ میں ایک بات ہے لیکن وہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے اس کا تجسس اور بڑھا دیا۔

اس دوران ڈائریکٹر آ کر ہمیں سین سمجھانے لگا۔ اس میں ثریا کا ایک گانا تھا جو رومانی انداز میں ہم پر پکچرائز ہونا تھا۔ اس میں پیانو، گلاب کی کیاری اور چند دوسری چیزوں کے ساتھ ہمارے سین تھے۔ میں نے اچھے اور ماہرانہ انداز میں یہ سین پکچرائز کرائے۔ ان کی رومانی نوعیت کی وجہ سے پہلے ہی دن ہمارے درمیان اجنبیت اور تکلف کی دیوار گر گئی۔ ثریا کی خوش مزاجی کی وجہ سے بھی مجھے بہت کم وقت میں اس کے ساتھ دوستانہ انداز اختیار کرنے میں مدد ملی۔

اس کی نانی اور ماموں کے درمیان ثریا کی کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر جلی حروف میں اس کا نام بھی نظر آ رہا تھا لیکن سین ختم ہونے کے بعد بھی ثریا اس پر جا کر نہیں بیٹھی اور پیانو کا سہارا لیے میرے قریب ہی کھڑی رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''ہاں..... اب بتاؤ..... وہ کیا بات تھی جو تم نے کہا تھا کہ میں بعد میں بتاؤں گا؟''

وہ میری بات بھولی نہیں تھی اور شاید شوٹنگ کے دوران بھی اس کا ذہن اسی میں پھنسا ہوا تھا۔

''میں آپ کی تعریف کرنا چاہتا تھا..... لیکن آپ کی تعریف تو نہ جانے کتنے لوگ کرتے ہوں گے..... اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اسے سن کر شاید آپ یہ سمجھیں کہ میں آپ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے نیچی آواز میں کہا۔

''لیکن اپنی تعریف سننا ہر عورت پسند کرتی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم کہو تو سہی..... کیا کہنا چاہتے تھے؟''

اس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر میں نے کہا۔ ''تمہاری آنکھیں ایسی ہیں جیسے کسی ملکہ کے چہرے پر دو ہیرے جگمگا رہے ہوں.....''

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔ شاید اسے میرے الفاظ اچھے لگے تھے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''لیکن..... تمہاری ناک ذرا بڑی ہے..... مگر تمہارے چہرے پر پھر بھی اچھی لگتی ہے.....'' یہ کہتے ہوئے میں نے انگلی سے اس کی ناک کو چھو بھی لیا اور بات جاری رکھی۔ ''میرا جی چاہ رہا ہے کہ اس ناک کی وجہ سے تمہارا نام ''نوزی'' رکھ دوں۔ میں جس لڑکی کے ساتھ بھی کام کرتا ہوں، اسے کوئی نہ کوئی ''نک نیم'' ضرور دیتا ہوں۔''

''کیا تم نے بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ کام کر لیا ہے؟'' وہ شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں..... کام تو چند ہی لڑکیوں کے ساتھ کیا ہے..... لیکن وہ خاص طور پر منتخب شدہ تھیں..... میرا مطلب ہے ڈائریکٹرز نے انہیں منتخب کیا تھا۔'' میں نے قدرے شریر لہجے میں کہا۔

وہ ایک بار پھر ہنسی اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''تمہارا دیا ہوا نک نیم مجھے پیارا لگا ہے۔''

میرا دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہماری یہ پہلی ملاقات ہی خاص تھی۔ شاید یہ اسی قسم کی ملاقات تھی جس میں پہلی نظر میں ہی دو انسانوں کے درمیان کوئی خاص تعلق استوار ہو جاتا ہے۔

دوسرے روز آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران ثریا نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے، تمہاری شکل گریگوری پیک سے بہت ملتی ہے؟''

''ہاں..... بہت سے لوگ بہت عرصے سے یہ کہتے آ رہے ہیں لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میرا خیال ہے میں گریگوری پیک سے زیادہ خوش شکل ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ گویا میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے خوب کھل کر ہنسی پھر بولی۔ ''بہت خود اعتمادی ہے تم میں.....'' اس کی نظریں اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے مجھے پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے گھوم کر بہ ظاہر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آئینے میں اپنے میک اپ کا جائزہ لینا شروع کر دیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ آئینے میں بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس روز اس نے بھی مجھے ایک نک نیم دیا۔ وہ تھا ''اسٹیو''۔ نہ جانے کیوں اسے یہ نام اچھا لگتا تھا۔

''اگر تمہیں یہ نام اچھا لگتا ہے تو مجھے قبول ہے۔ مجھے بھی یہ اچھا لگنے لگا ہے۔'' میں نے کہا۔ اس روز سے ہم ایک دوسرے کے لیے ''نوزی'' اور ''اسٹیو'' ہوگئے۔

اس روز شوٹنگ ختم کر کے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے وقت ہم نے ہاتھ ملایا۔ میں نے ذرا معنی خیز انداز میں اس کا ہاتھ آہستگی سے دبایا۔ جواباً اس نے بھی آہستگی سے اسی طرح میرا ہاتھ دبایا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے دلی جذبات اس تک پہنچ رہے تھے۔ میری رگ و پے میں ایک عجیب سی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

یہ ہماری دوستی کا آغاز تھا۔ یہ دوستی بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہوئی اور پھر محبت میں ڈھل گئی۔ فلمی رسالوں اور اخباروں کے فلمی صفحات پر ہمارے بارے میں خبریں چھپنے لگیں جن میں کچھ سچ ہوتا کچھ جھوٹ..... عوام بہرحال گہری دلچسپی سے یہ خبریں پڑھنے لگے۔ بہت سی محفلوں میں، چٹخارے لے لے کر ہمارے بارے میں قصے بیان کیے جاتے۔ ملک بھر میں ہمارے عشق کے چرچے ہونے لگے۔

ایک طرف ہمارا عشق پروان چڑھ رہا تھا اور دوسری طرف صورتحال یہ تھی کہ میرے بھائی چیتن کی بنائی ہوئی فلم ''نیچا نگر'' کو پہلے کانز فلم فیسٹیول میں گولڈن پام ایوارڈ مل گیا اور وہاں اس کی کافی تعریفیں بھی ہوئی تھیں لیکن اپنے ملک میں اس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی..... بلکہ پذیرائی تو دور کی بات ہے، کوئی ڈسٹری بیوٹر اسے خریدنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوا۔ چیتن ایک قابل ڈائریکٹر تھے لیکن پہلی ہی فلم کے اس بری طرح ڈوب جانے کی وجہ سے ان کے سامنے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ وہ بے حد پریشان تھے۔ میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنے بڑے بھائی کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔

فلمی دنیا میں ایک ہیرو کے طور پر میرا کچھ مقام بن چکا تھا۔ میں نے سوچا، کوشش کر کے دیکھوں کہ اپنے بھائی کے لیے اپنی پوزیشن سے میں کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہوں یا نہیں۔ میں اپنے بھائی کو کچھ بتائے بغیر اپنے ایک پروڈیوسر کے آفس جا پہنچا۔ میں نے اسے اپنی آمد کی کوئی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ اچانک مجھے اپنے آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر قدرے حیران ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

اپنے گھر میں ثریا کی حیثیت قیدی جیسی ہوگئی

تحسین جہم

قسط : 13

جب ہم بیٹھ چکے اور رسمی باتیں ہوچکیں تو میں نے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایڈوانس کے طور پر کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ میرے معاوضے میں سے کاٹ لیجئے گا۔ میں ایک کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔“

میرا مطالبہ گو کہ اچھی خاصی رقم کا تھا لیکن پروڈیوسر کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ اس نے رقم مجھے دے دی اور میں سیدھا اپنے بڑے بھائی کے پاس جا پہنچا۔

”میں اور آپ ایک مشترکہ پروڈکشن کمپنی قائم کررہے ہیں۔ آپ اس کے تحت فلم بنانے کی تیاری شروع کریں۔ میں، آپ اور ثریا مرکزی کرداروں میں ہوں گے۔“ میں نے اچانک چیتن کو اپنے یہ فیصلے سنائے تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔

چیتن نے حیرت کے حملے سے سنبھلنے کے بعد پوچھا ”یہ سب ہوگا کیسے؟ پروڈکشن کمپنی قائم کرنے اور فلم بنانے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“

میں نے جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اپنے بھائی کے سامنے رکھ دیں اور کہا ”اس رقم سے کام شروع کیا جائے گا۔ اس کا کچھ حصہ ایڈوانس کے طور پر ثریا کو دیا جائے گا جو آپ کی فلم کی ہیروئن ہوگی..... اور اگر آپ اجازت دیں گے تو ہیرو میں ہوں گا۔“

چیتن یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مجھے گلے لگالیا۔

انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر اسٹیج ڈرامے تیار کرنے کا ایک ادارہ بنا رکھا تھا جس کا نام ”انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن“ تھا جسے مختصراً IPTA کہا جاتا تھا۔ اس ادارے کے تحت انہوں نے ایک ڈرامہ پیش کیا تھا جو انہوں نے لکھا بھی خود ہی تھا۔ یہ روسی مصنف نکول گوگول کی کہانی ”دی انسپکٹر جنرل“ سے متاثر ہوکر لکھا گیا ایک طنزیہ و مزاحیہ ڈراما تھا جو بے حد مقبول ہوا تھا۔ چیتن اور بلراج ساہنی نے اس میں مرکزی کردار ادا کئے تھے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ ہم اسی ڈرامے کو فلم کی شکل دیں گے۔

پروڈکشن کمپنی کا نام ”نوکیتن“ رکھا گیا جس کا مطلب تھا ”نیا بینر۔“ کمپنی کی پہلی فلم کی ہیروئن کے طور پر ثریا کو سائن کرلیا گیا۔ فلم کا نام ”افسر“ تھا۔ اب کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب میری ثریا سے ملاقات یا فون پر بات نہ ہوتی۔ میں واقعی اس کے عشق میں گرفتار ہوچکا تھا اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں پہلی بار عشق کے اصل مفہوم یا اس کی روح سے واقف ہوا تھا۔ جس دن میں اس کے گھر نہ جاتا یا کسی اور جگہ بھی اس سے ملاقات نہ ہوتی، اس روز وہ بھی اداس اور خفا سی ہوجاتی اور مجھے بھی یوں لگتا کہ وہ میری زندگی کا ایک نہایت بے کار اور بے مقصد دن تھا۔

میں باندرہ سے لوکل ٹرین میں بیٹھتا۔ چرچ گیٹ اسٹیشن پر اترتا اور وہاں سے پیدل میرین ڈرائیو پہنچ کر ثریا کے گھر کی کال بیل بجاتا۔ ہم کسی کونے کھدرے میں سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور تقریباً سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ اس دوران ثریا کے گھر والوں کی عقابی نظریں ہماری نگرانی کرتی رہتیں اور ہم کوئی بے تکلفانہ حرکت نہ کرپاتے۔ ہماری بے تکلفی بس سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے محبت کی باتیں کرنے کی حد تک تھی۔

عشق میں ہماری سنجیدگی دیکھ کر ایک لابی ہمارے خلاف ہوگئی۔ ہمارا عشق اب کوئی راز نہیں رہا تھا..... اور رہتا بھی کیسے؟ ہم جہاں بھی ایک دوسرے کو دیکھتے، ہماری نظریں اور ہمارے تاثرات کچھ ایسے ہوجاتے جیسے ہم ایک دوسرے میں سما جانا چاہتے ہوں۔ ثریا کے گھر والے اور کچھ ایسے لوگ جو اکثر انہیں گھیرے رہتے تھے، انہوں نے اس عشق کو تشویش کی نظر سے دیکھنا شروع کردیا تھا۔ میں نے اور ثریا نے خفیہ طور پر منگنی کرلینے کی باتیں بھی شروع کردی تھیں۔ یہ اطلاع بھی ہمارے عشق کی مخالفت کرنے والی لابی تک پہنچ گئی اور ثریا کے گھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

کچھ لوگ باقاعدگی سے ثریا کے گھر آکر دیر تک اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ان میں سے کئی خود ثریا کے امیدوار تھے۔ انہوں نے اس معاملے کو مذہبی رنگ دینا شروع کردیا کہ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ہندو سے کیسے ہوسکتی تھی؟ وہ روزانہ سب گھر والوں کے کان بھرتے رہے جس کے نتیجے میں ثریا کی نانی میرے سب سے زیادہ خلاف ہوگئیں۔ مالی معاملات سمیت گھر کے سبھی معاملات پر نانی کا کنٹرول تھا۔ ہر معاملے میں ایک سخت گیر حاکم کی طرح نانی کا ہی حکم چلتا تھا۔ البتہ میں محسوس کرتا تھا کہ ثریا کی والدہ کے دل میں میرے لئے نرم گوشہ موجود تھا اور وہ ہمارے ملاپ کے خلاف نہیں تھیں، لیکن اس بے چاری کی گھر میں چلتی ہی نہیں تھی۔ ان کا کردار ایک خاموش تماشائی جیسا تھا۔

رفتہ رفتہ اپنے ہی گھر میں ثریا کی حیثیت قیدی کی سی ہوگئی۔ اب اسے دوستانہ انداز میں میرے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اس کے گھر جاتا تو میرا استقبال نہایت سرد مہری سے ہوتا۔ ڈرائنگ روم میں فلم انڈسٹری کے کئی افراد بیٹھے نظر آتے جو مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کرتے۔ ان میں ثریا کی پچھلی فلموں کے ڈائریکٹر بھی ہوتے اور آنے والی فلموں کے بھی..... کچھ ثریا سے شادی کے امیدوار ہوتے اور کچھ اس فیملی کے خوشامدی..... وہ سب میری طرف ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے۔ میں وہاں اپنے آپ کو زبردستی کا مہمان محسوس کرتا۔ آخر کار میں نے وہاں جانا چھوڑ ہی دیا۔

پابندیاں عائد کرنے کے سلسلے میں ثریا کی نانی کی ہمت اور بڑھ گئی۔ وہ ہماری فلم ”افسر“ کی شوٹنگ کے دوران سیٹ پر بیٹھتی تو ہماری حرکات و سکنات کی باقاعدہ نگرانی کرتی۔ اس نے ہمارے لئے آپس کی کوئی ذاتی بات کرنا ناممکن بنادیا۔ ہم صرف اپنے اپنے فلمی مکالمے بول سکتے تھے اور اپنے سین شوٹ کراسکتے تھے۔ ان کے سلسلے میں بھی ثریا کی نانی نے شرط عائد کردی تھی کہ ہم رومانی مناظر میں بھی جسمانی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لگیں گے۔ اسکرپٹ کے مطابق جن مناظر میں ہماری قربت اور اظہار محبت کی بعض حرکات دکھائی جانی تھیں، ان کی فلمبندی کے سلسلے میں وہ عورت ہنگامہ کھڑا کرنے لگی۔

وہ سیٹ پر کیمرے کے قریب اڑ کر بیٹھ جاتی اور شوٹنگ کی کڑی نگرانی کرتی۔ ایک سین میں اسکرپٹ کے مطابق مجھے والہانہ انداز میں ہولے سے ثریا کی آنکھوں کی خوبصورتی کے اعتراف میں آنکھوں کو چومنا تھا۔ ثریا کی نانی نے اس سین کی شوٹنگ رکوادی اور حکم صادر کردیا کہ وہ ہرگز مجھے ثریا کی آنکھیں چومنے نہیں دے گی۔ آخر کار اسی کی ایک جاننے والی خاتون نے ہم سے تعاون کیا اور کسی بہانے سے اسے بلا کر چند منٹ کے لئے فلور سے باہر لے گئی۔ تب ہم نے افراتفری کے سے عالم میں یہ سین شوٹ کرلیا۔

اس دن مجھے حتمی طور پر اندازہ ہوگیا کہ اپنی نجی یا پیشہ ورانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے فیصلوں میں بھی ثریا کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس کی زندگی کی باگ ڈور مکمل طور پر اس کی نانی کے ہاتھ میں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے مجھ سے دور کرنے کی جتنی کوششیں کی جارہی تھیں، اسے حاصل کرنے اور اس سے ملنے کی خواہش میرے دل میں اتنی ہی شدت اختیار کررہی تھی۔ عشق میں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ رومیو جولیٹ، لیلیٰ مجنوں کی داستانیں آپ نے پڑھی ہوں گی۔ میری کیفیت ان سے مختلف نہیں تھی۔

ثریا سے اب میری ملاقات صرف فلم کے سیٹ پر ہوتی تھی اور وہ بھی اس عالم میں..... کہ تیز لائٹس ہمارے چہروں پر ہوتی تھیں، کیمرا سامنے ہوتا تھا اور قریب ہی ثریا کی نانی اپنی عقابی نظریں ہم پر جمائے بیٹھی ہوتی تھی۔ اب کچھ اور لوگوں نے بھی سیٹ پر اس کے ساتھ آنا شروع کردیا تھا اور وہ بھی نگرانی کے فرائض اس طرح انجام دیتے تھے جیسے انہیں خطرہ ہو کہ پریوں کی کہانیوں والا کوئی دیو ان کی شہزادی کو اٹھا کر لے جائے گا۔

میں اسکرپٹ سے ہٹ کر اس سے کوئی بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ساری صورت حال میرے لئے صرف دل شکن ہی نہیں تھی، میں اس میں اپنی اور اپنی محبت کی توہین بھی محسوس کرتا تھا۔ تاہم میرے دل میں ثریا کی طلب روز بہ روز بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اب یہ بھی میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے لڑکا اور لڑکی جب ایک دوسرے کو پانے کے سلسلے میں مایوس ہوجاتے ہیں تو ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض تو اس کیفیت میں خودکشی بھی کرلیتے ہیں۔

(جاری ہے)

پہلا عشق

ثریا اس وقت ایک گلوکارہ اور ہیروئن کے طور پر عروج پر تھی جب نووارد دیو آنند کو اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ دیو آنند کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ بہت جلد ثریا کے عشق میں گرفتار ہوجائیں گے۔ ان کا عشق جتنا بڑھتا گیا، ثریا کے گھر والوں کی مخالفت اتنی ہی بڑھتی گئی۔ ثریا اپنے گھر والوں..... خصوصاً اپنی نانی اور ماموں کے چنگل میں اسی طرح پھنسی ہوئی تھی جیسے پنجرے میں پنچھی۔ دیو آنند نے اس سے قربت بڑھانے اور اپنے بڑے بھائی چیتن کو کام میں مصروف کرنے کے لئے اپنی ذاتی پروڈکشن کمپنی ”نوکیتن“ کے تحت فلم ”افسر“ شروع کی تھی لیکن اس فلم کے دوران ثریا کے گھر والوں نے دیو اور ثریا کو ایک دوسرے سے بالکل ہی دور کردیا۔

دیو آنند نے اپنی دانست میں یہ تدبیر اپنے بھائی کو کام مہیا کرنے اور خود ثریا سے قریب ہونے کے لئے کی تھی لیکن اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلا۔ اس فلم کے دوران ثریا کی نانی نے دیو آنند اور ثریا کو ایک دوسرے سے بالکل دور کردیا۔ فلم ”افسر“ (1950ء) کی اس تصویر میں چیتن آنند، ثریا کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔

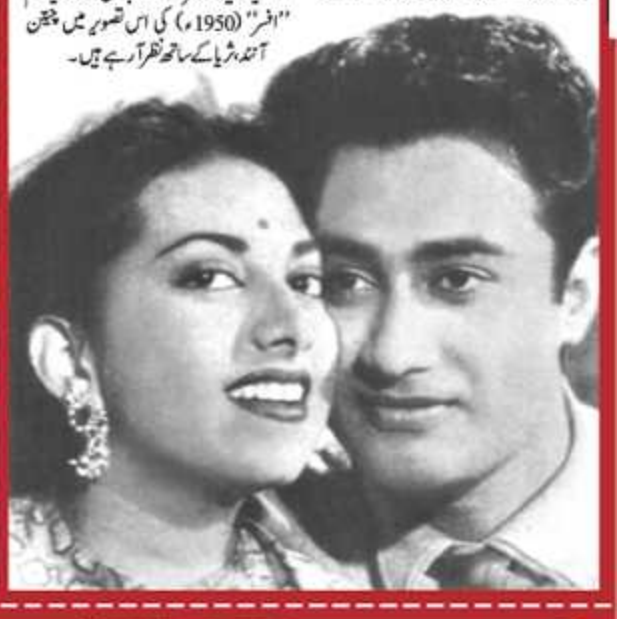

دو نوجوان دوستوں کے خواب

نیچے کی تصویر میں دیو آنند فلم ”بازی“ (1951ء) میں گیتا بالی کے ساتھ نظر آرہے ہیں جس کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ گیتا کو اداکاری کے لئے کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ وہ ہر کردار نہایت آسانی، روانی اور خوبصورتی سے کرتی چلی جاتی ہے۔ دوسری تصویر میں دیو آنند اپنے دوست گرودت کے ساتھ باندرہ کے علاقے میں آوارہ گردی کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس طرح کی آوارہ گردیوں کے دوران وہ دونوں اپنی جاگتی آنکھوں سے بہت سے خواب دیکھتے تھے۔ ایسی ہی آوارہ گردی کے دوران ایک بار گرودت نے دیو آنند سے کہا تھا کہ اگر میں ڈائریکٹر بن گیا تو تم میری فلم کے ہیرو ہوگے..... اور دیو آنند نے کہا تھا کہ اگر میں نے فلم بنائی تو تم اس کے ڈائریکٹر ہوگے۔ دیو آنند کو اپنا وعدہ پہلے پورا کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس ”نوکیتن“ کے نام سے قائم کیا تو گرودت کو فلم بنانے اور ڈائرکٹ کرنے کی دعوت دی۔ گرودت نے ان کے لئے ”بازی“ کے نام سے فلم بنائی جو سپرہٹ رہی۔

اُمید بھرے دِل

بمبئی آنے کے کچھ عرصے بعد دیو آنند اپنے بڑے بھائی چیتن کے ساتھ پالی ہل کے ایک مکان میں رہنے لگے تھے۔ دیو آنند اور چیتن کے علاوہ زہرہ سہگل اور ان کے شوہر کمیشور بھی اس مکان کا کرایہ شیئر کرتے تھے۔ یہ مکان فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد اور ”انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن“ (IPTA) نامی ادارے کا گڑھ تھا۔ خوشحالی آنے کے بعد دیو آنند نے اس مکان کو خرید لیا تھا اور اس میں ”آنند ریکارڈنگ اسٹوڈیو“ قائم کیا تھا۔ تصویر میں اس مکان میں تقریباً روز جمع ہونے اور اپنے اپنے میدان میں سرگرم رہنے والے لوگوں کے درمیان نیچے سے اوپر کی طرف بالترتیب دائروں میں تینوں بھائیوں دیو آنند، وجے آنند اور چیتن آنند کے علاوہ زہرہ سہگل، ایس ڈی برمن، مدن پوری اور گرودت بھی موجود ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دو آتشہ کی داستان حیات

میرا محبت نامہ خفیہ طور پر ثریا کو مل گیا

تمکین تبسم

قسط : 14

میں بہرحال خودکشی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں آسانی سے ہار ماننے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں خوش گمان بھی تھا۔ اکثر معاملات میں اچھی امیدیں رکھتا تھا۔ جلدی مایوس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ثریا سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تو اپنے جذبات تحریر کی صورت میں اس تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس مقصد کے لئے میں نے فلم ''جیت'' کے کیمرا مین دیو سچا کا تعاون حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے روز جب میں ''جیت'' کے سیٹ پر تھا اور لائٹس وغیرہ درست کی جارہی تھیں تو میں نے دیو سچا کو ایک کونے میں روکا اور نیچی آواز میں اس سے کہا ''مجھ پر ایک احسان کرو گے؟''

''ارے..... کیسی باتیں کررہے ہو میرے ہیرو!'' وہ حیران ہوکر بولا۔ ''میں بھلا تم پر احسان کروں گا؟ حکم کرو..... میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ باقاعدہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک لمحے کے لئے جھکتے ہوئے بولا۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن مجھے بے تکلفی سے مخاطب کرنے کے باوجود میرا بے حد احترام کرتا تھا۔ میں اپنے مقصد کے لئے اسے یوں بھی زیادہ موزوں شخص سمجھ رہا تھا کہ اس کے ثریا اور اس کے گھر والوں سے بہت اچھے مراسم تھے۔

''تمہیں میرا ایک خط رازداری سے ثریا کو پہنچانا ہوگا۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''جو حکم میرے آقا!'' وہ چراغ کے جن کی طرح سعادت مندی سے بولا۔

ثریا بھی اس وقت سیٹ پر موجود تھی۔ وہ ایک طرف اپنی نانی اور ماموں کے درمیان کچھ اس طرح بیٹھی تھی جیسے ایک بھیڑ دو قصابوں کے درمیان بیٹھی ہو۔ اس کی نانی اور ماموں دوسرے دو تین آدمیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے اور ساتھ ساتھ چائے سگریٹ وغیرہ سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ جن لوگوں سے وہ باتیں کررہے تھے، ان کی خدمات انہوں نے غالباً باڈی گارڈز کے طور پر حاصل کررکھی تھیں۔

میں نے ایک کونے میں بیٹھ کر جلدی جلدی ایک کاغذ پر چند سطریں گھسیٹیں۔ وہ عجلت میں لکھا گیا ایک مختصر خط تھا لیکن میں نے اس میں اپنے دلی جذبات بیان کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ دیو سچا نے اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے انجام دیا اور جب شوٹنگ ختم ہوئی تو میرا خط ثریا کے ہینڈ بیگ میں پہنچ چکا تھا۔

دوسرے روز شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے دیو سچا جب میرے چہرے کے نزدیک ایک چھوٹی لائٹ سیٹ کررہا تھا تو موقع پاکر اور سب کی نظر بچا کر اس نے ایک لفافہ میری جیب میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں بعض لوگ.....! ان کے خطوں کے جواب فوراً آجاتے ہیں۔''

مناسب موقع دیکھ کر میں نے گوشۂ تنہائی میں جاکر ثریا کا خط پڑھا۔ اس نے لکھا تھا ''تمہارا خط پڑھتے ہوئے میں رو رہی تھی۔ جدائی کی آگ میں صرف تم ہی نہیں، میں بھی جل رہی ہوں۔ میرا جو حال ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ تم نے جتنی محبت کا اظہار کیا ہے، مجھے بھی تم سے اتنی ہی محبت ہے۔ میں خود تم سے ملنے کی آرزو میں مری جارہی ہوں۔ کل شام سات بجے مجھے فون کرنا۔ میں فون کے قریب موجود رہوں گی۔''

دوسرے روز ٹھیک سات بجے میں نے اسے فون کیا۔ دوسری طرف سے اس کی دلکش آواز میں ''ہیلو'' سنتے ہی میری رگ و پے میں ایک عجیب سی سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔

''نوزی.....!'' میں نے اپنے دل میں امنڈتی ہوئی ساری محبت کو اپنے لہجے میں سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ثریا کی طرف سے اس کا کوئی جواب آنے کے بجائے اچانک فون پر ایک کرخت آواز ابھری ''کون بول رہا ہے؟'' یہ اس کی نانی کی آواز تھی۔ پھر پس منظر میں ثریا کے سسکی لینے کی آواز سنائی دی۔ میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا گیا تھا۔

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو دوسری طرف کھٹ سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں بھی باز آنے والا نہیں تھا۔ میں نے ڈھٹائی سے دوبارہ نمبر ملالیا اور جب دوسری طرف ریسیور اٹھایا گیا تو میں نے تصدیق چاہی ''ثریا.....؟''

''ثریا گھر پہ نہیں ہے۔'' نانی کرخت آواز میں چلائی اور پھر اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیسری بار نمبر ملایا۔ اس بار بھی نانی نے فون اٹھایا۔ میری آواز سن کر وہ کرخت آواز میں غصے سے چنگھاڑتے ہوئے بولی ''اگر اب تم نے فون کیا تو پولیس آکر تم سے بات کرے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے ریسیور پٹخا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ فون ہی نہ ٹوٹ گیا ہو۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ میں اس وقت اپنی مایوسی اور دل شکستگی کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے اپنی زندگی بے معنی اور بے مقصد محسوس ہورہی تھی۔ میں ایک عجیب سی مایوسی کے عالم میں سوچ رہا تھا ''یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے جس میں، میں اس لڑکی سے ایک منٹ بات بھی نہیں کرسکتا جس سے مجھے زندگی میں سب سے زیادہ محبت ہے؟''

میں نے ایک گھنٹہ صبر کیا اور اس کے بعد ایک بار پھر ثریا کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس بار دوسری طرف سے جو نرم سی آواز سنائی دی، وہ نہ تو ثریا کی تھی اور نہ ہی اس کی نانی کی..... میں نے اندازہ لگایا کہ اس بار ثریا کی والدہ نے فون اٹھایا تھا۔

''کیا آپ ممی بول رہی ہیں؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''ہاں..... دیو.....!'' دوسری طرف سے بھی سرگوشی میں جواب ملا۔

''کیا میں ثریا سے بات کرسکتا ہوں؟'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''نہیں.....'' ان کی دھیمی آواز میں افسردگی تھی ''وہ اس وقت رو رہی ہے..... اور اس کی نانی اس کے قریب ہی ہیں۔''

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں..... میرا اس سے ملنا بے حد ضروری ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا لیکن اس سرگوشی سے بھی میری بے تابی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

''وہ بھی تم سے ملنا چاہتی ہے لیکن.....'' ثریا کی ممی الجھن آمیز انداز میں خاموش ہوگئیں۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے کہا ''تم ایک گھنٹے بعد فون کرو۔ میں کوئی تدبیر سوچتی ہوں۔''

میرے لئے گویا مایوسی کے تاریک افق پر امید کی ایک مدھم سی کرن نمودار ہوئی۔ میں نے ٹھیک ایک گھنٹے بعد فون کیا تو ثریا کی والدہ نے ہی فون اٹھایا۔ وہ بولیں ''اب تم ثریا کو فون مت کرنا۔ بس کل رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد آجانا۔ ہماری بلڈنگ کے مین گیٹ سے اندر آکر تم سیڑھیوں کے راستے سیدھے اوپر چھت پر چلے جانا۔ ثریا وہاں تمہاری منتظر ہوگی۔ بس اسی طریقے سے..... اور اسی وقت ملاقات ممکن ہے اور کوئی طریقہ نہیں ہے.....''

سادھنا

سادھنا نے اپنی اور دیو آنند کی فلم ''ہم دونوں'' (1961ء) کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا تھا ''جب مجھے اس فلم میں کاسٹ کیا گیا اور بتایا گیا کہ اس میں دیو آنند میرے ساتھ ہوں گے تو میں خوشی سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی کیونکہ میں اس وقت نووارد تھی اور وہ ایک سپر اسٹار تھے۔ تاہم ہماری جوڑی کو بے حد پسند کیا گیا۔'' یہ تصویر اسی فلم کی ہے۔

یہ ساری بات انہوں نے سرگوشیوں میں کی تھی۔ بات ختم کرتے ہی انہوں نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فون رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لئے تو میرا دماغ گویا محبت کی معطر فضاؤں میں اونچی پرواز کرنے لگا لیکن پھر اچانک میرا ذہن دوسرے پہلو کی طرف بھی چلا گیا۔

''کہیں یہ مجھے پھانسنے کے لئے کوئی چال تو نہیں ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

فوراً ہی میرے اندر سے ایک آواز ابھری ''نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔''

پہلی آواز ایک بار پھر ابھری ''پھر بھی..... سوچ لو..... اگر تم رات کو اس طرح ثریا کی بلڈنگ میں گھستے ہوئے پکڑے گئے تو بہت بڑا اسکینڈل بن جائے گا..... اخبارات اور رسائل میں کیسی کیسی سرخیاں لگیں گی..... عین ممکن ہے تم جیل ہی پہنچ جاؤ.....!''

میرے اندر یہ کشمکش چلتی رہی لیکن آخرکار میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ مجھے ثریا کی ماں پر بھروسا کرنا پڑے گا۔ اس خاندان میں ثریا کے علاوہ وہی واحد فرد تھیں جو مجھے پسند کرتی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں اور میرے خلاف کسی سازش کا حصہ نہیں بن سکتی تھیں۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

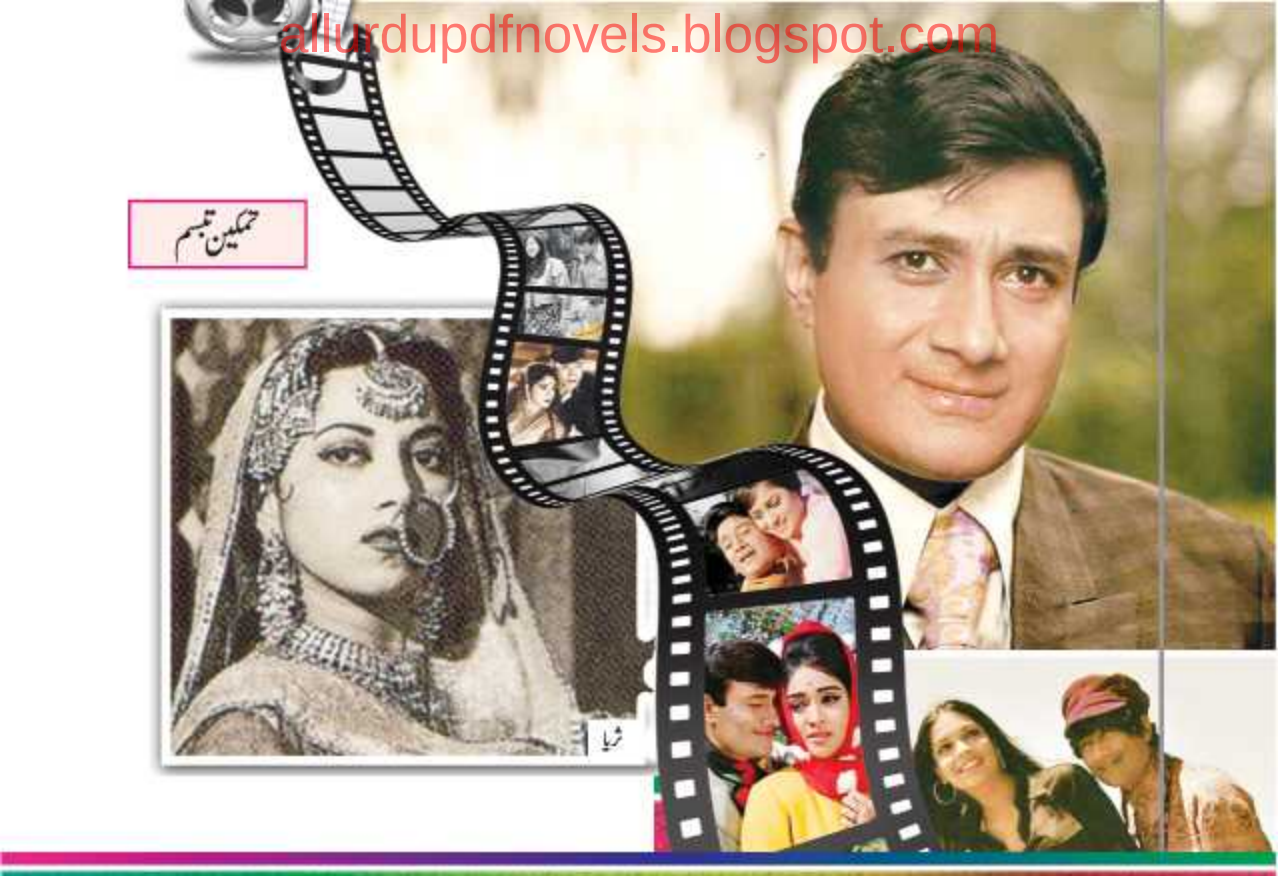

تمکین تبسم

اس نے منگنی کی انگوٹھی سمندر میں پھینک دی

قسط : 15

میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا، البتہ یہ احتیاط ضرور کی کہ اپنے آبائی شہر گورداسپور کے رہنے والے اپنے سابق کلاس فیلو اور دوست تارا کو اس راز میں شریک کرلیا اور اس کا تعاون بھی حاصل کرلیا۔ تارا اب بمبئی پولیس میں انسپکٹر تھا۔ ہم دونوں دوسرے روز رات کو مقررہ وقت سے کافی پہلے ہی ساحل سمندر کے اس مقام پر چلے گئے جہاں سامنے ہی کچھ فاصلے پر وہ بلڈنگ تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر ثریا کا نہایت کشادہ اپارٹمنٹ تھا۔ اس کا نام ''کرشنا محل'' تھا۔

میں اور تارا اندھیرے میں سمندر کی دیوار کے قریب جہاں کھڑے تھے وہاں سے ثریا کی بلڈنگ کی چھت نظر آرہی تھی۔ تارا نے چھوٹی سی ایک ٹارچ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم ذرا بھی گڑبڑ محسوس کرو تو میری طرف رخ کرکے اس ٹارچ کو دو مرتبہ جلانا بجھانا۔ میں بھی یہاں سے دو مرتبہ اپنی ٹارچ جواب میں جلاؤں بجھاؤں گا اور پھر تمہاری مدد کے لئے دوڑ پڑوں گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں..... میرے پاس ریوالور بھی موجود ہے''۔

اپنے دوست تارا کی باتیں سن کر مجھے تحفظ کا احساس ہوا۔ وہ پولیس انسپکٹر تھا اور اس وقت اس کی منصوبہ بندی سے مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی جاسوسی فلم کا سین پکچرائز کرا رہے ہوں۔ میں نے اپنی رولیکس گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ یہ چند منٹ گزارنا مجھے بہت مشکل محسوس ہوا۔ جونہی گیارہ بجنے کو ہوئے، میں تیزی سے بلڈنگ کے قریب جا پہنچا۔

ٹھیک گیارہ بجے میں بلڈنگ میں داخل ہوگیا اور کسی بلی کی طرح بے آواز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر جا پہنچا۔ اس وقت چھ منزلوں کی سیڑھیاں طے کرنا بھی گویا میرے لئے ایک معمولی سی بات تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کتنی سیڑھیاں چڑھا ہوں۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی سوال تھا کہ کیا واقعی ثریا چھت پر میری منتظر ہوگی؟ مجھے اس وقت صرف اسی ایک بات کی فکر تھی۔ زندگی کا باقی ہر مسئلہ، ہر خیال میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

میں نے ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پانی کی ٹنکی کے قریب مجھے ایک ہیولا سا نظر آیا تو میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ہیولا تیزی سے میری طرف اور میں اس کی طرف بڑھا۔ فاصلہ کم ہوا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ ثریا تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں سما گئے۔ شدتِ جذبات سے ہماری حالت عجیب تھی۔ میری طرح شاید ثریا کو بھی یہی محسوس ہو رہا ہو کہ کسی بھی لمحے سینے کا قفس توڑ کر دل باہر آجائے گا۔

کافی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی ایک لفظ بھی نہ بول سکا لیکن یہ خاموشی، یہ سکوت گویا سب کچھ کہہ رہا تھا۔ لفظوں کا سہارا لئے بغیر ہمارے جذبات ایک دوسرے تک پہنچ چکے تھے۔ اس کی حالت کسی سہمے ہوئے پنچھی جیسی تھی۔ پھر میں نے اس کا چہرہ اوپر کیا تو یہ دیکھ کر مجھے دھچکا لگا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں پر آرہے تھے۔

مجھے اس وقت اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے بلاتمہید کہا ''مجھ سے شادی کروگی؟''

میری بات سن کر وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔ اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر یہ مسکراہٹ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ شاید کسی پری کے چہرے پر بھی نہ لگتی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ مجھے اپنی بانہوں میں بھینچتے ہوئے بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی۔ ''آئی لو یو..... آئی لو یو..... آئی لو یو.....''

ہماری یہ ملاقات بہ خیر و عافیت ختم ہوگئی۔ تارا باہر، سمندر کے کنارے انتظار کرتا رہا، لیکن مجھے اس کو ٹارچ سے خطرے کا سگنل دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

دوسرے روز میں نے زیوری بازار جاکر ایک بیش قیمت انگوٹھی خریدی اور اس تصور سے خوش ہونے لگا کہ ثریا کی انگلی پر یہ انگوٹھی کتنی خوبصورت لگے گی۔ شام کو میں نے فون پر ثریا کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے اس کی نانی کی کرخت آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون کیا، تب بھی ثریا کی نانی نے ہی اٹھایا۔ مجھے ایک بار پھر خاموشی سے سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ جب تیسری بار بھی ایسا ہوا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ ثریا کی نانی مستقل طور پر فون کی نگرانی کر رہی تھی اور اب یہ ممکن معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس کے سوا کوئی فون اٹھائے گا۔

میں نے نہایت مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں اپنے کیمرامین دوست دیویچا کو فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر بولا۔ ''کیا مجھے تمہارا ایک اور محبت نامہ ثریا کو پہنچانا ہے؟''

''نہیں.....'' میں نے کہا۔ ''اس بار محبت نامہ نہیں، بلکہ منگنی کی انگوٹھی پہنچانی ہے۔''

دیویچا اسی روز میرے پاس آیا اور مجھ سے انگوٹھی لے کر ثریا کے گھر چلا گیا۔ دوسرے روز اس نے رپورٹ دی کہ ثریا انگوٹھی دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور جس طرح راز داری سے وہ انگوٹھی اس تک پہنچی تھی، اسی طرح راز داری سے اس نے اسے اپنے زیورات کے ایک خاص ڈبے میں رکھ دیا تھا۔ اس نے دیویچا کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کس شدت سے مجھ سے محبت کرتی تھی۔ یہ سن کر میں گویا ہواؤں میں اڑنے لگا۔

میں نے ثریا کو منگنی کی انگوٹھی دے کر گویا اپنے طور پر ہی طے کرلیا تھا کہ اب وہ اور میں ایک دوسرے کے منگیتر ہوگئے تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ہم دونوں اور دیویچا کے علاوہ کسی کو اس منگنی کا علم نہیں تھا اور نہ ہی اسے کسی اور کی تائید حاصل تھی۔ عملی طور پر بھی صورت حال یہ تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ملاقات بھی نہیں کرسکتے تھے۔ فلم میں جن مناظر میں ہم دونوں ساتھ تھے، ان کی شوٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ اب ہمارے پاس ایک دوسرے سے ملنے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔

کئی ہفتے گزر گئے اور ہم نے ایک دوسرے کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ہمارے درمیان کسی محبت نامے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا۔ بے تابیِ دل جب حد سے بڑھی تو میں نے ایک بار پھر دیویچا کی خدمات حاصل کیں کہ وہ میرا پیغام لے کر ثریا کے پاس جائے تاکہ ملاقات کی کوئی سبیل نکلے، لیکن اس مرتبہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ ثریا کی نانی نے دروازہ کھولا اور دیویچا کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے فوراً ہی ایک جھٹکے سے بند کرلیا۔ ''ہم نے اپنے بہترین دوستوں کا بھی اپنے گھر میں داخلہ بند کردیا ہے اور ہم اس کی وجہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔''

کلپنا کارتک کو دیو آنند کی کمپنی ''نوکیتن'' نے فلموں میں متعارف کرایا تھا۔ اس کا اصل نام مونا سنگھ تھا۔ ''بازی'' میں دیو آنند اور کلپنا نے پہلی بار ایک دوسرے کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد وہ مزید چھ فلموں میں اکٹھے جلوہ گر ہوئے۔ فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' (1954ء) کی تکمیل کے دوران ان دونوں نے خفیہ طور پر شادی کرلی، جس کے بعد کلپنا نے فلموں میں کام کرنا چھوڑ دیا۔ بائیں جانب تصویر اسی فلم کی ہے۔

کلپنا کا کہنا تھا ''فلموں میں کام کرنا میرے لئے صرف ذریعۂ معاش تھا کیونکہ میرے والد کا انتقال ہوگیا تھا اور ہمارے گھر کے اخراجات پورے کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ میرے لئے فلمی زندگی میں کوئی کشش نہیں تھی اور نہ ہی میں اس سے کبھی لطف اندوز ہوئی۔''

ان کی ازدواجی زندگی کے دوران افواہیں اڑتی رہیں کہ دیو آنند بیوی کے ساتھ وفادار نہیں تھے لیکن دیو آنند کا کہنا تھا ''میں روزانہ رات کا کھانا گھر جاکر بیوی کے ساتھ کھاتا ہوں۔ آپ ذرا گنتی کرکے بتائیں کہ کتنے اداکار ایسا کرتے ہیں۔''

دیویچا اپنا سا منہ لے کر واپس آگیا تاہم اس نے درست معلومات حاصل کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ معتبر ذرائع سے پتا چلا کہ مجھ سے ثریا کی شادی کے مسئلے پر اس کی فیملی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ایک طرف ثریا اور اس کی والدہ تھیں۔ دوسری طرف ثریا کی نانی اور خاندان کے باقی تمام افراد تھے۔ ثریا کی والدہ کو ثریا کی مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن ثریا کی نانی نے کہہ دیا تھا کہ اگر یہ شادی ہوئی تو وہ ثریا کو قتل کرادے گی یا پھر خودکشی کرلے گی۔ ثریا پر خاندان کا دباؤ اتنا بڑھا کہ آخرکار اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور شکست تسلیم کرلی۔

اس نے سب کے سامنے قسم کھائی کہ وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکے گی۔ چند دن بعد وہ رات کو گھر سے نکل کر سمندر تک گئی اور میری انگوٹھی کو سمندر میں جتنی دور تک پھینک سکتی تھی، پھینک دیا۔ پھر وہیں ساحلِ سمندر پر بنی ہوئی چھوٹی سی دیوار سے لگ کر اس نے ایک گانا بھی گایا۔ آپ نے نہ جانے کتنی فلموں میں ایسے مناظر دیکھے ہوں گے لیکن یہ کسی فلم کا نہیں، حقیقی زندگی کا منظر تھا جسے شوٹ کرنے کے لئے کوئی کیمرا اور کوئی ڈائریکٹر موجود نہیں تھا۔

دیویچا نے جب معتبر ذرائع سے معلوم کی ہوئی یہ سب باتیں مجھے بتائیں تو میرا دل بھی گویا میری منگنی کی انگوٹھی کی طرح دکھ کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ دیویچا بولا۔ ''اگر شیکسپیئر آج زندہ ہوتا تو تمہارے عشق کی کہانی پر ایک نیا ڈراما لکھتا جو اس کے اپنے ہی ڈرامے ''رومیو اینڈ جولیٹ'' کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا۔''

وہ شگفتہ انداز میں بات کرکے اپنی دانست میں میرا دکھ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرا دکھ کم ہونے والا نہیں تھا۔ مجھے اپنی زندگی ہی بے مقصد اور بے معنی محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ جاکر اسی سمندر میں چھلانگ لگا دوں جس کی تہہ میں کہیں میری انگوٹھی، میری محبت کی نشانی پڑی تھی۔ دوسری طرف میں خودکشی کو بزدلی بھی سمجھتا تھا۔ شاید اسی لئے میں اپنے ارادے پر عمل کرنے سے باز رہا۔

تاہم اس وقت مجھے دلجوئی اور تشفی کی بھی بڑی ضرورت تھی۔ آخرکار میں اپنے بڑے بھائی چیتن کے پاس چلا گیا اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر خوب رویا۔ انہوں نے شاید اس لئے مجھے دیر تک رونے کا موقع دیا کہ آنسوؤں کے ساتھ میرے دل کا کچھ غبار نکل جائے۔ پھر انہوں نے مجھے بہت دلاسا دیا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا۔ ''عشق میں ناکامی انسان کو مضبوط بناتی ہے۔ انسانی زندگی بہت سے ابواب پر مشتمل کتاب کی طرح ہے۔ ایک باب ختم ہوتا ہے تو اگلا باب شروع ہوتا ہے۔ ثریا سے تمہارا عشق بھی زندگی کا ایک باب تھا۔ اس باب کو اسی طرح ختم ہونا تھا۔ اب اسے بھولنے کی کوشش کرو اور اگلا باب شروع کرو۔''

.....O.....

ہماری قائم کردہ کمپنی ''نوکیتن'' کی پہلی فلم ''افسر'' رومانی اور مزاحیہ تھی۔ اس میں کرپشن پر طنز بھی کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد کچھ عرصے تک تو کرپشن ملک میں معمولی سطح پر رہی تھی لیکن اس کے بعد کینسر کی طرح تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔ اس موضوع کو ہماری فلم میں غالباً پہلی بار چھیڑا گیا تھا۔ اس فلم کو داد تو بہت ملی اور ہم دونوں بھائیوں کا مقام بھی فلم انڈسٹری میں کچھ مستحکم ہوا لیکن کاروباری طور پر یہ کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں رہی۔

ہم نے اگلی فلم کی منصوبہ بندی شروع کی۔ ہم چاہتے تھے کہ اگلی فلم سے ہمیں صرف داد و تحسین ہی نہ ملے بلکہ ہم کچھ پیسہ بھی کما سکیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے دوست گرودت سے وعدہ کیا تھا کہ میں کوئی فلم بناؤں گا تو وہ اس کا ڈائریکٹر ہوگا۔ میں نے اسے فون کرکے بلایا۔ وہ آیا تو اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔ ''اگلا کش لینے سے پہلے میری بات غور سے سن لو..... پونا میں آوارہ گردی کے دوران ہم نے ایک پہاڑی پر کھڑے ہوکر ایک وعدہ کیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے پہلے فلم بنائی تو میں اس کا ہیرو ہوں گا اور میں نے کہا تھا کہ اگر میں نے تم سے پہلے فلم بنائی تو تم اس کے ڈائریکٹر ہوگے۔ مجھے تم سے پہلے اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تم میری آئندہ فلم کے ڈائریکٹر ہو۔''

اس نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سگریٹ کا کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔ مجھے اس دھوئیں میں سے کامیابی کی خوشبو آئی۔ میں کچھ ہی دنوں پہلے عشق میں ناکامی کے تجربے سے گزرا تھا۔ دلِ مجروح میں ابھی اس ناکامی کا بوجھل پن باقی تھا لیکن ساتھ ہی ایک قسم کی آزادی کا احساس بھی تھا۔ میں اپنے آپ کو اس پرندے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس کے پاؤں میں کوئی نادیدہ زنجیر بندھی ہوئی تھی جو اب ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ پرواز کرنے کے لئے آزاد تھا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

مونا مجھے اچھی لگنے لگی

قسط : 16

ہم نے اپنی کمپنی کے بینر تلے بنائی جانے والی اگلی فلم کا نام ''بازی'' تجویز کیا تھا۔ ایک روز مجھے چیتن کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ایک نئی لڑکی مل گئی ہے جو ہماری اس فلم کی ہیروئن ہو سکتی ہے۔ اس کا نام مونا سنگھ تھا اور وہ سینٹ بیڈز کالج، شملہ کی پڑھی ہوئی تھی۔ چیتن نے اس کا فلمی نام کلپنا کارتک تجویز کیا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ ہم دونوں کا اکٹھے ایک اچھے اسٹوڈیو میں فوٹو سیشن کرا لیا جائے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ وہ میرے ساتھ کیسی لگے گی۔

وہ وائی ایم سی اے ہوسٹل میں اپنی والدہ کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ ہم نے وہاں سے ان دونوں کو لیا اور اسٹوڈیو میں فوٹو سیشن کرانے کے بعد ہم گویا نئی ہیروئن ملنے کی خوشی منانے ساحل سمندر پر چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر مونا سنگھ عرف کلپنا کارتک کی شوخی، شرارتوں، حرکات و سکنات اور گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان اور پُرکشش تو تھی ہی..... لیکن زندہ دل اور ذہین بھی تھی۔ اس نے ایک اچھے کالج سے تعلیم حاصل کی تھی جس کے معیار کی تعریف کی جاتی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ اس نے صرف ضرورت کے تحت فلمی دنیا کا رخ کیا تھا کیونکہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور اب ان کے گھرانے کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے لئے فلموں میں کام تلاش کرنا بھی ایسے ہی تھا جیسے وہ کوئی نوکری تلاش کرنے نکلی ہو۔ کچھ دیر کی اس تفریحی سی ملاقات میں وہ مجھے ہر اعتبار سے اچھی لگی۔

جلد ہی وہ میری زندگی میں کافی اہمیت حاصل کر گئی۔ ہماری کمپنی نے اسے ہوسٹل سے نکلوا کر ایک گیسٹ ہاؤس میں کمرا دلوا دیا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی سڑک پر کھلتی تھی۔ میں تقریباً روزانہ شام کو اس سے ملنے جا پہنچتا اور اس کھڑکی کے نیچے گاڑی روک کر ہارن دیتا۔ وہ لپک کر کھڑکی میں آتی اور مسرت بھرے انداز میں ہاتھ ہلا کر اشارہ کرتی کہ وہ تیار ہے اور فوراً نیچے آ رہی ہے۔ چند لمحے بعد وہ میرے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھتی اور ہم سیر و تفریح کے لئے نکل جاتے۔

پھر میرے مالی حالات کچھ اور بہتر ہوئے تو میں نے ذرا اچھی اور مہنگی گاڑی خریدنے کا فیصلہ کیا۔ میں شوروم پہنچا تو مجھے ایک کنورٹیبل پسند آئی۔ مجھے اس کا یہ فائدہ بھی نظر آیا کہ کھلی چھت کی اس گاڑی میں جب میں سڑکوں سے گزروں گا تو میرے زیادہ پرستار مجھے دیکھ سکیں گے۔ وہ ہاتھ ہلائیں گے تو میں بھی ہاتھ ہلاؤں گا۔ اس دوران شوروم کے منیجر نے مجھے اس کی ایک اور خوبی بتا دی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ہارن، موسیقی کی ایک خوبصورت دُھن کے انداز میں بجتا تھا اور وہ دُھن کچھ ایسا تاثر دیتی تھی جیسے کوئی محبوب اپنی محبوبہ کو بلا رہا ہو۔

منیجر کے اس انکشاف نے اس کار کو میرے لئے اور بھی پسندیدہ بنا دیا۔ میں نے اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ہارن بجایا تو اس کی نغمگی بھری دُھن سن کر، شوروم میں چاروں طرف موجود چھوٹے چھوٹے کمروں سے سیلز گرلز سر نکال کر جھانکنے لگیں۔ مجھے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر انہوں نے مسرت بھرا نعرہ لگایا۔ پھر ان میں سے ایک بولی۔ ''سر! آپ ہماری شہزادی کو لے جا رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ اس کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

مجھے پتا چلا کہ شوروم کی سیلز گرلز نے اس ماڈل کو گاڑیوں کی شہزادی کا خطاب دے رکھا تھا۔ میں جب اس گاڑی میں بیٹھ کر شوروم سے نکلا تو خود کو ایک شہزادہ محسوس کر رہا تھا۔ وہاں سے میں سیدھا اس گیسٹ ہاؤس جا پہنچا جہاں مونا مقیم تھی۔ گاڑی کو دیکھ کر اس نے بھی ہلکی سی، مسرت بھری چیخ ماری۔ ہم دونوں ایک بار پھر جو ہو جا پہنچے جہاں میں پہلی ملاقات کے بعد ہی اسے لے گیا تھا۔ اس دن کے بعد روزانہ ہی میری گاڑی کا ہارن سن کر مونا کے گیسٹ روم کے دیگر کمروں سے بھی عورتیں اور مرد جھانک کر دیکھتے۔ پھر وہ مونا کو میرے ساتھ روانہ ہوتے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے۔ سبز رنگ کی اس کنورٹیبل نے ہمیں ایک دوسرے کے اور بھی زیادہ قریب کر دیا۔

فلم ''بازی'' میں میرا کردار قدرے منفی تھا۔ ایک ایسا نوجوان جو کسی حد تک قانون شکن بھی تھا لیکن اس کے سینے میں گویا سونے کا دل تھا۔ اس فلم نے صحیح معنوں میں مجھے اسٹار بنا دیا۔ پریمیئر شو کے بعد میں ناظرین کے ہجوم کے ساتھ سینما ہال سے نکلا تو میرے سر پر وہی ٹوپی تھی جو میں نے فلم میں پہنی تھی۔ لوگوں نے مجھے پہچان کر کندھوں پر اٹھا لیا۔ ان کا والہانہ پن دیکھنے والا تھا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فلم کا چکر بھی عجیب ہے۔ لوگ تاریک سینما ہال میں بیٹھ کر فلم دیکھتے ہیں۔ ان کے ذہنوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کسی کو اسٹار بنا دیتے ہیں اور کسی کو گمنامی کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ کوئی اسٹار شہرتوں کے افق پر دیر تک چمکتا رہتا ہے اور کوئی تھوڑی دیر کے لئے جھلملاہٹ دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔

میرے سر سے ٹوپی اتارنے کے لئے بہت سے ہاتھ بڑھ رہے تھے۔ میں نے خود ہی اسے سر سے اُتار کر ہوا میں اچھال دیا۔ حیرت انگیز طور پر ایک لڑکی اسے کٹی پتنگ کی طرح لوٹنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ اسے اپنے سر پر رکھ کر میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی بھاگ گئی۔ پریمیئر شو پر ہی لوگوں کے اس ردِعمل سے ظاہر ہو گیا کہ فلم کامیاب تھی۔ مونا اس شو میں نہیں آ سکی تھی۔ وہ ان دنوں دہلی میں تھی۔ اس نے آدھی رات کے بعد وہاں سے فون کیا تو میں نے اسے فلم کی کامیابی کے بارے میں بتایا۔

''تمہیں معلوم ہے فلم کیوں کامیاب ہوئی؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔

''اس لئے کہ میں اس کی ہیروئن تھی۔'' اس نے مجھے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا اور زوردار قہقہہ لگایا۔ چھیڑ چھاڑ کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔

کسی فلم کا سپرہٹ ہو جانا، اس سے وابستہ سبھی لوگوں کا مقدر پلٹ دیتا ہے۔ ''بازی'' کی کامیابی نے بطور ہدایتکار گرودت کو راتوں رات بلندیوں پر پہنچا دیا۔ بلراج ساہنی نے اسکرین پلے لکھنے میں معاونت کی تھی اور مکالمے بھی لکھے تھے۔ اس کی بھی 'واہ واہ' ہو گئی۔ ایس ڈی برمن کی موسیقی اور ساحر لدھیانوی کی شاعری کا تال میل ایسا کامیاب ہوا کہ آنے والے کتنے ہی برسوں میں ان کی جوڑی دھوم مچاتی رہی۔ گیتا بالی اور میں اپنی اداکاری کے لئے بہت زیادہ داد سمیٹنے میں کامیاب رہے جبکہ بطور ہیروئن مونا سنگھ عرف کلپنا کارتک کے نام پر بھی کامیابی کی مہر لگ گئی۔

اس کے تقریباً پچاس سال بعد کی بات ہے..... نصف صدی بعد کا قصہ ہے کہ میں اپنے دانتوں کے کسی مسئلے کے سلسلے میں اپنے ڈینٹسٹ سے ملنے کے بعد اس کے کمرے سے نکل رہا تھا تو آفس اور ویٹنگ روم کے درمیان موجود شیشے کی ایک پتلی سی دیوار سے ٹکرا گیا۔ ایک زوردار چھناکا ہوا اور پوری دیوار کرچیوں میں تبدیل ہو کر فرش پر بکھر گئی۔ شیشے کے کچھ ننھے ننھے ٹکڑے اور ذرات میرے کپڑوں پر بھی آن گرے تھے۔

حیرت انگیز طور پر مجھے خراش تک نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سر جھکائے تیزی سے باہر جانے کے لئے نکلا تھا اور میرا سر ذرا آگے کو تھا۔ سر پر دیسی ہی دیز ٹوپی تھی جو اب کافی حد تک میری پہچان بن گئی تھی۔ میرا سر ہی دراصل شیشے کی دیوار سے ٹکرایا تھا اور ٹوپی نے مجھے زخمی ہونے سے بچا لیا تھا۔ کلینک میں سناٹا چھا گیا تھا اور چند لمحوں کے لئے سبھی خوفزدہ سے ہو گئے تھے۔ پھر جب لوگ حیرت اور خوف کے جھٹکے سے سنبھلے تو سب میری طرف لپکے۔ ڈینٹسٹ اور ان کا اسسٹنٹ بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔

غلطی میری تھی۔ میں سر جھکائے یوں روانہ ہوا تھا جیسے بہت جلدی میں ہوں۔ میں ہمیشہ ہی بہت جلدی میں دکھائی دیتا ہوں۔ تیز تیز چلتا ہوں۔ تیزی سے بات کرتا ہوں۔ ہر کام تیزی سے کرتا ہوں۔ سر جھکا ہونے کی وجہ سے مجھے شیشے کی پتلی سی دیوار نظر نہیں آئی تھی۔ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے مریضوں اور ڈاکٹر وغیرہ نے مجھے سنبھالا اور میرے کپڑے جھاڑے۔

''آپ کی ٹوپی نے آپ کو بچا لیا مسٹر دیو آنند!'' میرے اردگرد موجود لوگوں میں سے کسی نے کہا۔

''اسی لئے تو میں یہ ٹوپی پہنتا ہوں۔'' میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

لوگوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ میرے اردگرد ہجوم سا لگ گیا۔ ان میں سے بعض نے میرے آٹوگراف لینے کے لئے آٹوگراف بکس بھی میری طرف بڑھانی شروع کر دیں۔

''کیا آپ سب لوگ ممبئی کے ہی رہنے والے ہیں؟'' میں نے آٹوگراف دینے کے دوران پوچھا۔ اب بمبئی کا نام ممبئی ہو چکا تھا۔

''جی ہاں.....'' ان میں سے ایک لڑکی نے جواب دیا۔ ''اور میری دادی آپ کی اتنی بڑی پرستار ہیں کہ انہوں نے وہ ٹوپی آج تک شیشے کے ایک شوکیس میں سنبھال کر رکھی ہوئی ہے جو آپ نے اپنی فلم ''بازی'' کے پریمیئر شو کے بعد ہوا میں اچھالی تھی اور وہ ان کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس وقت وہ مجھ سے بھی کم عمر تھیں۔''

میری یادداشت کے دھندلے افق پر اچانک اس لڑکی کا چہرہ بہت واضح انداز میں ابھر آیا جو لوگوں کے بہت بڑے ہجوم میں میری ٹوپی اُچک لینے میں کامیاب رہی تھی اور ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے بھاگ گئی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے کچھ بھی نہ بول سکا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ لوگ فلم اسٹارز سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ لڑکی نہایت دھیمے اور شیریں لہجے میں بولی۔ ''میری دادی کہتی ہیں کہ وہ اس وقت تک نہیں مریں گی جب تک دوبارہ آپ سے نہ مل لیں۔''

''آپ دادی کو بتا دینا کہ میں کبھی ان سے نہیں ملوں گا۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں، وہ کبھی نہ مریں۔'' میں نے کہا۔ اس پر سب لوگ ہنس دیئے۔

میں نے ایک محبت بھرے جملے کے ساتھ اس لڑکی کو ایک اور آٹوگراف دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ آٹوگراف خاص طور پر تمہاری دادی کیلئے ہیں۔''

☆.....☆.....☆

میں نے اور گرودت نے اطالوی فلم Bitter Rice اکٹھے دیکھی۔ فلم مجھے بھی بہت پسند آئی لیکن گرودت نے تو اس سے متاثر ہو کر اردو میں فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا نام ''جال'' تجویز کیا گیا اور گرودت نے اس میں میرے مقابل گیتا بالی کو کاسٹ کیا۔ شوٹنگ کے لئے ہم لوگ گوا کے نواحی علاقے ملوان گئے۔ گیتا بالی ایک بہت اچھی اداکارہ بھی تھی اور نہایت عمدہ رقاصہ بھی..... اس کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک تھی اور چہرے پر شوخی رقصاں رہتی تھی۔

ملوان یوں تو درحقیقت مچھیروں کی بستی تھی لیکن نہایت خوبصورت فطری مناظر سے گھری ہوئی تھی اور ساحل سمندر پر واقع تھی۔ ایک روز میں اور گیتا بالی ساحل پر شوٹنگ کر رہے تھے۔ بیچ میں وقفہ آ گیا۔ اس دوران کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اداکار کے۔ این سنگھ تھے جنہیں پوری فلم انڈسٹری 'انکل' کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ جس ہٹ (Hut) میں مقیم تھے، اس کے دروازے سے جھانک کر مجھے اندر بلا رہے تھے۔ میں نے گرودت سے اجازت طلب کی کہ کیا میں انکل کے پاس چلا جاؤں؟ گرودت نے اجازت دے دی۔

میں ہٹ میں پہنچا تو اندازہ ہوا کہ انکل کے۔ این سنگھ کچھ پی پلا رہے تھے اور ذرا ترنگ میں تھے۔ انہوں نے سفید سیال کا ایک گلاس بھر کے مجھے بھی تھمانے کی کوشش کی۔ میں نے معذرت کی اور انہیں بتایا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ انکل فوراً بولے۔ ''یہ شراب نہیں ہے..... یہ تو ٹانک ہے..... طاقت کا شربت سمجھو اسے..... یہ مقامی لوگوں کا بنایا ہوا ٹانک ہے۔ بہت خوش ذائقہ ہے۔ ذرا پی کر دیکھو..... تم اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرو گے۔''

مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کوئی مقامی شراب تھی..... لیکن انکل نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں ایک تو کیا، دو گلاس حلق سے اتار گیا۔ نتیجہ یہ کہ جب میں انکل کے ہٹ سے نکلا تو میں بھی ترنگ میں تھا۔ گرودت کو اب میرا اور گیتا بالی کا سین شوٹ کرنا تھا جس میں مجھے گیتا بالی کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتے ہوئے پانی میں جانا تھا اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچ کر گردن گھما کر ہم دونوں کو کلوز اپ دینا تھا۔ یہ ذرا رومانی قسم کا سین تھا۔

کیمرا آن ہوا۔ میں اور گیتا بالی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتے ہوئے پانی میں اترے۔ جب ہم گھٹنوں تک پانی میں پہنچے تو گرودت نے چیخ کر ہمیں رکنے کی ہدایت کی، لیکن اب چونکہ میں بھی انکل کے۔ این سنگھ کی طرح ترنگ میں تھا، اس لئے میں اس ہدایت کو خاطر میں نہ لایا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں تو خیر ترنگ میں تھا لیکن گیتا بالی اس کے بغیر ہی اس وقت شیر کی بچی ثابت ہوئی۔ اس نے بھی نہ تو مجھ سے ہاتھ چھڑایا اور نہ ہی رکنے کی کوشش کی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں سمجھا میری زندگی کا سفر ختم ہو گیا

قسط : 17

گرودت چیختا ہی رہ گیا اور ہم اتنا آگے چلے گئے کہ پانی ہماری ٹھوڑیوں کو چھونے لگا۔ پھر اچانک ایک لہر آئی اور ریت ہمارے پیروں تلے سے نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے ہم دونوں پانی میں غوطے کھا رہے تھے۔

ہمارے منہ اور ناک میں نمکین پانی بھر گیا اور ہم دونوں بدحواسی میں ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ تیرنا ہم دونوں میں سے کسی کو نہیں آتا تھا۔ وہ شاید ہماری زندگی کا آخری سین ہوتا لیکن ہماری قسمت اچھی تھی کہ ایک موج آئی جس نے ہم دونوں کو واپس ساحل پر لا پٹخا جہاں گرودت اور یونٹ کے دوسرے لوگوں نے ہمیں سنبھال لیا۔

میرا نشہ تو فوراً ہی ہرن ہو چکا تھا لیکن اس کے بعد بھی مجھے اس واقعے کے اثرات سے سنبھلنے میں پوری رات لگ گئی۔ میرے خیال میں قدرت نے مجھے اور گیتا بالی کو نئی زندگی دی تھی مگر گیتا بالی بلاشبہ ایک غیر معمولی عورت تھی۔ وہ نہ تو اس وقت گھبرائی تھی جب ڈوبنے لگی تھی اور نہ ہی بعد میں اس پر زیادہ دیر تک اس واقعے کے اثرات نظر آئے۔ وہ تو تھوڑی دیر بعد ہی ہنسنے بولنے لگی تھی۔

ملوان میں شوٹنگ ختم ہو چکی تھی اور دوسری صبح چھ بجے یونٹ کے لوگوں کو بمبئی جانے کے لئے موٹر بوٹ پکڑنی تھی جبکہ مجھے اپنی بڑی سی شیورلے میں پونا سے ہوتے ہوئے بمبئی جانا تھا۔ گیتا بالی نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ کار میں لے چلوں۔ وہ بوٹ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے بہ خوشی اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ وہ اگلی سیٹ پر میرے برابر بیٹھی تھی جبکہ پچھلی سیٹ پر اس کی بہن اور میرا ڈرائیور بیٹھے تھے۔ میری تقریباً پوری رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ اس کے باوجود ڈرائیونگ میں خود کر رہا تھا۔ وہ ایک نہایت پُرلطف سفر تھا۔ سب بڑی موج میں تھے۔

حالانکہ میں اچھی خاصی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا لیکن گیتا بالی مجھے اکسانے لگی۔

''آج تم تیز رفتاری کے، اپنے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالو۔''

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی لیکن وہ مسلسل مجھے رفتار مزید بڑھانے پر اکساتی رہی۔ وہ یقیناً خطر پسند طبیعت کی مالک تھی۔ خطرات سے ڈرتی نہیں تھی۔ میں رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی اور کار کی کھلی کھڑکیوں سے ہوا 'شاں شاں' کی آواز کے ساتھ آ رہی تھی۔ گیتا بالی کے بال تیزی سے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہم گویا ہر چند سیکنڈ بعد نئے سنگ میل کے پاس سے 'زن' کر کے گزر جاتے۔

ہنستے کھیلتے، قہقہے لگاتے یونہی سفر طے ہو رہا تھا لیکن پھر مجھے ایسا لگا کہ غنودگی کے دباؤ نے چند سیکنڈ کیلئے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا۔ شاید چند لمحوں کیلئے میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے بیدار ہوا تو گاڑی کچے میں اُتر چکی تھی اور اُچھلتی کودتی نہ جانے کس سمت میں جا رہی تھی۔ پھر اچانک مجھے سامنے ایک درخت نظر آیا، میں نے گاڑی کو روکنا چاہا لیکن اس وقت شاید ایک سیکنڈ کیلئے مجھے یاد نہیں آیا کہ گاڑی کیسے رکتی ہے۔

دوسرے ہی لمحے ایک زوردار آواز کے ساتھ گاڑی درخت سے ٹکرائی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ میں شاید صرف چند سیکنڈ کیلئے ہی بے ہوش ہوا تھا۔ جب میں دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوا تو گاڑی ایک عجیب سے زاویے پر، ترچھی لگی ہوئی تھی۔ ہوا میں اٹھا ہوا اس کا ایک پہیہ مجھے اس وقت بھی تیزی سے گھومتا ہوا دکھائی دیا۔

میں نے بڑی مشکل سے گردن ذرا سی گھما کر گیتا کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی پیشانی سے خون بہتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ اگر اس کی پیشانی پر ہمیشہ کیلئے زخم کا نشان پڑ گیا تو اس کے کیریئر پر بہت برا اثر پڑے گا..... اور اس کا ذمے دار میں ہوں گا۔

ذرا دقت سے میرے حلق سے آواز نکلی اور میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''میں تو ٹھیک ہوں..... تم اپنی سناؤ۔''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گیتا کی بہن اور میرا ڈرائیور بھی ٹھیک ہی دکھائی دیئے لیکن دہشت کی وجہ سے انہیں گویا سکتہ سا ہو گیا تھا۔ میں نے جب ہلنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے پورے جسم میں..... اور خاص طور پر پسلیوں میں بے پناہ درد کا احساس ہوا۔ اسٹیئرنگ وہیل میرے سینے میں تقریباً گھسا ہوا تھا۔ میرے پاؤں بریک اور ایکسیلیٹر وغیرہ میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ میرے لئے ذرا بھی حرکت کرنا محال تھا۔ میں بے بسی سے کراہ کر رہ گیا.....

اردگرد موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ اس زمانے میں ویسے بھی ٹریفک بہت کم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بڑی سی ایک اسٹیشن ویگن وہاں سے گزری۔ ہمیں دیکھ کر ویگن میں سوار لوگ رک گئے۔ دو افراد اس ویگن میں سے اترے اور تیزی سے ہماری طرف آئے۔

قریب آ کر ان میں سے ایک شخص حیرت سے بولا۔ ''ارے..... یہ تو دیو آنند ہیں!''

دوسرا بولا۔ ''اور یہ گیتا بالی ہیں!''

میں اسٹیئرنگ وہیل اور سیٹ کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ بڑی مشکل اور احتیاط سے مجھے گاڑی سے نکالا گیا۔ پھر باقی لوگوں کو بھی نکالا گیا اور ہمیں اسٹیشن ویگن میں اپنے ساتھ لے کر وہ لوگ پونا کی طرف روانہ ہو گئے۔ ذرا سی حرکت سے بھی مجھے اس قدر تکلیف ہو رہی تھی کہ ویگن کو نہایت سست رفتاری سے چلایا جا رہا تھا۔ اسپتال پہنچنے تک کئی بار میں بے ہوش سا ہوا اور مجھے یہ گمان گزرا کہ شاید میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ تب مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میری والدہ نے پیشگوئی کی تھی کہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی بنے گا لیکن میری ترقی کا سفر تو ابھی شروع ہی ہوا تھا اور زندگی کا سفر ختم ہونے کی نوبت آ گئی۔ کم از کم میں یہی سمجھا تھا کہ میری زندگی کا سفر ختم ہو گیا ہے۔

اس قسم کے حسرت آمیز خیالات کے دوران مجھے ذرا زیادہ ہوش آیا تو میں نے گیتا بالی سے کہا ''اگر تمہاری پیشانی پر زخم کا نشان رہ گیا تو کیا ہو گا؟''

''تمہیں اس فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں..... ہمیں تو تمہاری فکر ہے۔ میری پیشانی پر نشان رہ بھی گیا تو کیا ہوا..... چاند پر بھی تو داغ ہیں۔'' گیتا بالی نے زندہ دلی سے جواب دیا۔ وہ واقعی ایک باکمال عورت تھی۔

پونا پہنچ کر ہمیں اسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں تندہی سے ہمارا علاج شروع ہو گیا۔ بمبئی میں اس حادثے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ گاڑیوں میں بھر بھر کر ہماری عیادت کرنے اور اصلی صورت حال جاننے کیلئے آنے لگے۔ ہمارے فلمساز ادارے ''نوکیتن'' کی فلم ''آندھیاں'' کی شوٹنگ منسوخ کر دی گئی۔ اخباروں میں شہ سرخیوں میں اس حادثے کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ بعض جگہوں پر تو میری موت کی افواہ بھی اُڑ گئی۔

فرینک کیپرا اس زمانے میں ہولی وڈ کا ایک مشہور فلم ڈائریکٹر تھا۔ ان دنوں انڈیا میں پہلا انٹرنیشنل فلم فیسٹیول منعقد ہو رہا تھا۔ فرینک کیپرا اس میں شرکت کیلئے آیا ہوا تھا اور امریکی وفد کی سربراہی کر رہا تھا۔ میری خیریت جاننے کیلئے اس نے بھی ٹیلیگرام بھیجا جس میں میری جلد صحت یابی کے لئے دعا کی گئی تھی۔ فیسٹیول کے افتتاح پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ میں اس کے کام کا بڑا مداح تھا اور میں نے اس کی فلم ''اِٹ از اے ونڈرفل لائف'' دو مرتبہ دیکھی تھی۔

مجھے صحت یاب ہونے میں زیادہ دن نہیں لگے۔ بمبئی واپس آ کر ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہماری فلم ''آندھیاں'' فلاپ ہو گئی لیکن ہمیں اس کو اٹلی کے فلم فیسٹیول میں لے جانے کا موقع ملا۔ جہاں میری ملاقات گریگوری پیک سے بھی ہوئی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ میری شکل میں اس کی کچھ شباہت تھی۔ وہ بیرون ملک میرا پہلا دورہ تھا۔ اس کے بعد مجھے فرانس، انگلینڈ اور سوئٹزرلینڈ کا دورہ کرنے کا موقع بھی ملا جس سے میری معلومات، مشاہدے اور تعلقات میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ بطور اداکار میرا نام اور شخصیت بین الاقوامی سطح پر پہچانی گئی۔

میرے بڑے بھائی چیتن نے ہمارے ادارے ''نوکیتن'' کے تحت بطور ہدایت کار دو فلمیں بنائیں۔ دونوں ہی فلاپ ہو گئیں۔ ان ناکامیوں نے چیتن کو مایوس اور دل شکستہ کر دیا۔ ہماری دوسری فلم ''آندھیاں'' میں تو اس نے میرا کردار ہی بہت مختصر کر دیا تھا۔ اوپر سے فلم فلاپ بھی ہو گئی۔ اس کی وجہ سے ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں تھوڑی سی رنجش اور بدگمانی بھی آئی لیکن جلد ہی دور ہو گئی اور ہمارے باہمی معاملات ٹھیک ہو گئے۔

ایک روز میں ایک اسٹوڈیو میں بیٹھا اپنی ایک فلم کی ایڈیٹنگ دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''آپ ٹیکسی ڈرائیور پر فلم کیوں نہیں بناتے؟ اس کردار میں بڑی جان ہے اور اس کے گرد کسی اچھی کہانی کا تانا بانا تیار کیا جا سکتا ہے۔''

بات میرے دل کو لگی اور میں نے اس پر غور شروع کر دیا۔ آخر ہم نے ''ٹیکسی ڈرائیور'' کے نام سے فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ کہانی لکھنے کا کام میرے چھوٹے بھائی گولڈی کو سونپا گیا۔ وہ کالج میں پڑھ رہا تھا اور وہاں کی ڈرامیٹک سوسائٹی کا صدر تھا۔ کالج کیلئے ڈرامے لکھتا اور پروڈیوس کرتا رہتا تھا۔ میں نے اپنے بھائیوں کو فلمی دنیا میں کام پر لگا لیا تھا۔ سب سے بڑے بھائی ہماری کمپنی کے انتظامی معاملات دیکھتے تھے۔ گولڈی سے کہانی لکھوانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمیں بہت کم بجٹ میں فلم بنانی تھی اور ہر شعبے میں بچت کرنی تھی۔ ''آندھیاں'' کی ناکامی نے ہماری کمپنی کی مالی حالت پتلی کر دی تھی۔

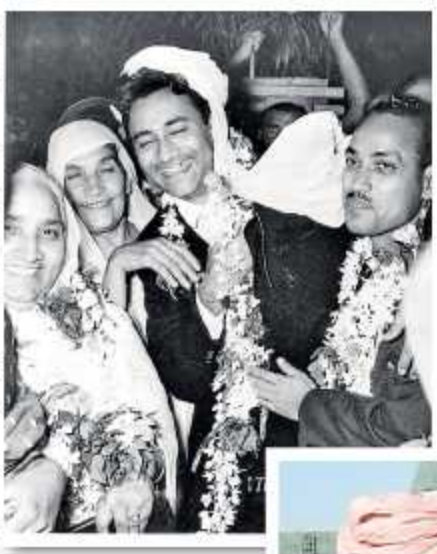

چھوٹے بھائی وجے (دائیں) اور والدہ (بائیں) سیتا دیوی کے ساتھ

دیو آنند، دہلی آمد کے موقع پر امریکی سفیر کے ساتھ

فلم شروع ہوئی تو ہم سب صبح سویرے کام پر نکلتے اور رات تک خون پسینہ ایک کرتے۔ مونا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ اسے گو کہ دوسرے فلمساز اداروں کی طرف سے آفرز آنے لگی تھیں لیکن وہ ابھی تک صرف ہماری کمپنی کیلئے کام کر رہی تھی۔ ہم نے ''ٹیکسی ڈرائیور'' کی شوٹنگ صرف 25 دن مکمل کر لی اور نہایت معمولی لاگت سے بنی ہوئی یہ فلم سپرہٹ ہو گئی۔ یوں ایک بار پھر یہ بات ثابت ہو گئی کہ صرف زیادہ لاگت کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت نہیں۔

مونا سنگھ عرف کلپنا کارتک کی پرفارمنس اس فلم میں زبردست رہی تھی اور وہ بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے اس سے کہا ''اب تو تمہیں دوسرے پروڈیوسرز کی طرف سے زیادہ آفرز آ رہی ہوں گی؟''

''ہاں..... آ تو رہی ہیں لیکن میں سب سے بڑی آفر کی منتظر ہوں۔'' اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں اس کا مطلب سمجھ تو گیا۔ پھر بھی میں نے وضاحت چاہی۔ اس نے اسی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تو چاہتی ہوں کہ ہمیشہ صرف تمہارے لئے کام کروں۔''

میں خاموش ہو گیا تو وہ بولی۔ ''کیا تم مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتے؟''

''مجھے سوچنے کے لئے وقت دو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں..... مجھے آج..... اور ابھی جواب دو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہم ساحل پر چلے گئے اور کچھ دیر گاڑی میں خاموش بیٹھے رہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں تھے۔ اچانک مونا نے اس طرح میرے سینے پر سر لگا دیا جیسے میرے دل کی دھڑکنیں سن رہی ہو۔ چند لمحے بعد وہ سر اٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''تمہارا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا ہے۔''

''ظاہر ہے، میں اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرنے جا رہا ہوں.....'' میں نے کہا۔

وہ منتظر نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آخر میں نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ''ہم کل منگنی کر لیتے ہیں۔''

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

میری اور مونا کی خفیہ شادی

راز نہ رہ سکی

قسط : 18

وہ سر اٹھا کر مسکرائی۔ آنسوؤں سے بھیگے اس کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ یوں لگ رہی تھی جیسے بارش کے دوران اچانک سورج نکل آیا ہو۔ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”ہم کوئی منگنی وغیرہ نہیں کریں گے۔ ہم صرف شادی کریں گے۔ میں صرف شادی کی انگوٹھی پہنوں گی اور فیصلہ تم مجھے آج ہی سناؤ گے۔“

وہ اپنے فیصلے پر مضبوطی سے جم جانے والی لڑکی تھی۔ میں نے چند لمحے سوچا اور آخر میں بھی فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے اس کے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... ہم شادی کر لیتے ہیں لیکن فی الحال یہ شادی راز رہے گی۔ یہ ہمارا حسین راز ہوگا۔“

”ٹھیک ہے..... مجھے منظور ہے۔“ مونا کے رخساروں پر اب آنسوؤں کی جگہ گویا قوس قزح پھیلتی نظر آنے لگی۔

میں نے گو کہ مونا سے شادی کیلئے یہ شرط رکھی تھی کہ ہم اسے خفیہ رکھیں گے، تاہم مونا اس پر بھی بہت خوش تھی۔ دو ہفتے بعد ہم نے فلم ”ٹیکسی ڈرائیور“ کی شوٹنگ کے دوران وقفہ آنے پر عدالت جا کر شادی کر لی۔ چند منٹ میں ہم میاں بیوی بن گئے اور عدالت کے رجسٹر میں اس حیثیت سے ہمارے نام درج ہو گئے۔ دو گواہوں کے علاوہ کوئی اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔

ہم سیٹ پر واپس آئے اور مونا شاٹ دینے لگی تو کیمرا مین رترا، کیمرے میں دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ”پچھلے شاٹ میں تو آپ کی انگلی میں یہ انگوٹھی نہیں تھی.....!“

وہ انگوٹھی میں نے مونا کو پہنائی تھی۔ وہ شادی کی انگوٹھی تھی اور مونا اسے اُتارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ شرمیلے انداز میں بولی۔ ”تم شاٹ لو..... میں انگوٹھی کو چھپا لوں گی۔“

کیمرا مین رترا کو کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا کہ معاملہ کیا تھا کیونکہ اسٹوڈیو میں کافی دنوں سے یہ افواہ اُڑنے لگی تھی کہ دیو اور مونا کسی روز خفیہ طور پر شادی کر لیں گے۔ کیمرا مین رترا سے ہم دونوں کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ ہماری طرف دیکھ کر شرارت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں نے اسے زبان بند رکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اور مونا نے اپنی دانست میں اس بات کو راز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن عام طور پر شوبز کے لوگوں کی شادیاں راز رہتی نہیں ہیں، خواہ وہ کتنی بھی کوشش کر لیں۔ ایک روز میرے والد بمبئی آئے اور میرے بڑے بھائی چیتن کے ہاں ٹھہرے۔ میرا گھر اب چیتن کے گھر سے دو تین گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ رات کو والد میرے پاس آئے۔ کئی برس بعد تنہائی میں ہماری ملاقات ہو رہی تھی۔

میں اس وقت حیران رہ گیا جب والد نے مجھ سے کہا۔ ”تم نے شادی کر لی اور اپنے باپ کو بتایا تک نہیں.....؟“ ان کا شکوہ بجا تھا۔

”میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔“ میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

اور شادی بھی تم نے ایک کرسچین لڑکی سے کی ہے؟“ ان کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ تو شاید میں برسوں بعد پوچھوں..... بشرطیکہ میں اس وقت تک زندہ رہا۔ بے شمار خوبصورت لڑکیاں تم سے شادی کیلئے مری جا رہی تھیں۔“

”لیکن مجھے جو اچھی لگی، میں نے اس سے شادی کر لی۔“ میں نے کہا۔

”تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں اپنے بُرے بھلے کا پتا نہیں۔“ وہ بولے۔

”ظاہر ہے..... والدین کے سامنے تو اولاد ہمیشہ بچہ ہی رہتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر تمہیں میری بات سننی بھی چاہئے۔“ وہ قدرے غصے سے بولے۔

”جب آپ چاہتے تھے کہ میں بینک میں کلرکی کر لوں..... کیا اُس وقت آپ نے میری بات سنی تھی؟ میں جب لاہور کے گورنمنٹ کالج سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنا چاہتا تھا، تو آپ نے میری بات سنی تھی؟“ یہ الفاظ بے اختیار میرے منہ سے نکلتے چلے گئے۔

”میرے مالی حالات ان دنوں اچھے نہیں تھے۔ میں ایک غریب آدمی تھا۔ میں تمہاری خواہشیں پوری کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔“ ان کا لہجہ نرم ہو گیا۔

”تو اب آپ اپنے اس بیٹے کو اپنی مرضی پر چلانے کی کوششیں کیوں کر رہے ہیں جس نے بمبئی آنے کیلئے آپ سے کرایہ بھی نہیں لیا؟ جس نے اس بے رحم شہر میں تنہا جدوجہد کی، جہاں ”گردن کاٹ“ مقابلہ چلتا ہے۔“ میں خاصے گستاخانہ..... اور شاید کافی حد تک بے رحمانہ لہجے میں یہ باتیں کئے جا رہا تھا۔

انہوں نے گہری سانس لی اور دھیمے لہجے میں بولے۔ ”بیٹا..... اسے ہی تقدیر کہتے ہیں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ تمہاری تقدیر تھی۔ میرے ساتھ جو ہوا، وہ میری تقدیر ہے..... لیکن شاید کبھی تمہیں میری باتیں یاد آئیں۔“

وہ اُٹھے اور شکست خوردہ سے انداز میں باہر کی طرف چل دیئے۔ وہ یکدم جیسے اپنی اصل عمر سے بھی زیادہ بوڑھے ہو گئے تھے اور دل شکستہ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے تیز و تند اور تلخ انداز میں ان سے باتیں کی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ انہیں روک لوں لیکن میری اَنا آڑے آ گئی اور میں نے انہیں جانے دیا۔

☆.....☆.....☆

”ٹیکسی ڈرائیور“ بڑے تزک و احتشام سے ریلیز ہوئی۔ ریلیز سے پہلے اس کی بہت شہرت ہو چکی تھی۔ وہ جس سینما میں ریلیز ہوئی، وہ ایک چوراہے پر، بڑی سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا۔ فلم کے پہلے شو پر چاروں طرف، دور دور تک ٹیکسیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ شہر کا ہر ٹیکسی ڈرائیور یہ فلم دیکھنے آیا ہوا تھا۔ وہ سب اسے ”اپنی“ فلم سمجھ رہے تھے۔ اس وقت شہر میں کسی بھی شخص کو کہیں جانے کیلئے ٹیکسی میسر نہیں تھی کیونکہ سارے ڈرائیور اسی سینما کے اردگرد اپنی ٹیکسیاں پارک کر کے، اندر فلم دیکھ رہے تھے۔

فلم کی شوٹنگ کے دوران شہر کی بہت سی سڑکوں پر لوگوں نے مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی وردی اور ٹوپی پہنے، ٹیکسی چلاتے دیکھا ہوگا اور شاید کسی کو گمان بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ان کے قریب سے دیو آنند گزرا ہے۔ ایک بار میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔ ایک سین پکچرائز کرانے کے دوران میں نے ایک ”سواری“ کو تاج محل ہوٹل کے سامنے اتارا تو جلدی سے ایک غیر ملکی گورا میری ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”جلدی سے ریڈ لائٹ ایریا (بازار حسن) چلو۔“

جب میں نے چند سیکنڈ تک گاڑی آگے نہیں بڑھائی تو وہ ذرا غصے سے بولا۔ ”کیا تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی..... یا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ریڈ لائٹ ایریا کہاں ہے؟ میرا خیال ہے تمہیں معلوم تو ضرور ہوگا..... ہر ٹیکسی ڈرائیور کو معلوم ہوتا ہے۔“

”سر..... معلوم تو ہے..... لیکن میری ٹیکسی کرائے پر نہیں چلتی۔“ میں نے شائستگی سے انگریزی میں جواب دیا۔

اس دوران کچھ فاصلے پر موجود، فلم یونٹ کے لوگ اور تماشائی اس صورتحال کو سمجھتے ہوئے ہنسنے لگے تھے۔ ان میں سے چند نوجوانوں نے قریب آ کر غیر ملکی سیاح کو بتایا کہ اس وقت وہ انڈیا کے ایک فلم اسٹار سے مخاطب ہے اور وہاں درحقیقت ایک فلم کا سین شوٹ ہو رہا ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔ میں نے اتر کر اس کیلئے دروازہ کھولا اور اپنی، ٹیکسی ڈرائیوروں والی ٹوپی اتار کر اسے سلام کیا۔

وہ ٹیکسی سے اترا اور قطعی بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سر..... آپ کا نام کیا ہے؟“ یکدم ہی اس نے مجھے ”سر“ کہنا شروع کر دیا۔

”سر.....! اگر آپ کے ملک میں انڈین فلم ”ٹیکسی ڈرائیور“ ریلیز ہو تو اسے دیکھ لیجئے گا۔ آپ کو میرا نام معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ سخت حیرت زدہ نظر آ رہا تھا اور غالباً ریڈ لائٹ ایریا جانے کا خیال اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

1954ء میری زندگی کا ایک اہم سال ہے۔ اس سال میں نے شادی کی اور اسی سال ریلیز ہونے والی میری فلم ”ٹیکسی ڈرائیور“ سے مجھے بطور فلم اسٹار بہت استحکام ملا۔ اسی سال مجھے خواجہ احمد عباس کی سربراہی میں ایک فلمی وفد کے ساتھ روس جانے کا موقع ملا۔ اسی سفر کے دوران میری ملاقات دنیا کے ایک بے مثال کامیڈین اور ڈائرکٹر چارلس چپلن عرف چارلی چپلن سے ہوئی۔ تین گھنٹے پر محیط اس ملاقات کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد روس نے اپنی حدود کے گرد گویا نظر نہ آنے والا ایک آہنی پردہ تان لیا تھا۔ باقی دنیا کے لوگوں کی ان کے ہاں آمد و رفت تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ جنگ سے تباہ شدہ روس، اسٹالن کی قیادت میں، سر جھکا کر، دنیا سے کٹ کے اپنی تعمیر نو میں جُت گیا تھا۔ 1954ء میں روس نے پہلی بار یہ آہنی پردہ اٹھایا اور دوسرے ملکوں کے لوگوں کو اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کر دیا۔ ان کی وزارت ثقافت نے انڈین فلم انڈسٹری کو بھی ایک وفد بھیجنے کی دعوت دی۔ خواجہ احمد عباس کی قیادت میں جو وفد روانہ ہوا، اس میں میرے علاوہ چیتن، بلراج ساہنی، بمل رائے، راج کپور، نرگس اور ہرش کیش مکرجی شامل تھے۔

سوویت یونین جاتے وقت ہم دو دن کیلئے سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت جنیوا میں رکے۔ وہاں سے ہمیں، اس وقت کے کمیونسٹ چیکوسلواکیہ کے دارالحکومت پراگ کیلئے فلائٹ پکڑنی تھی جہاں سے ہمیں ایک طیارہ ماسکو لے جاتا۔ اس زمانے میں چارلی چپلن سوئٹزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ انہیں امریکہ نے کمیونسٹ قرار دے کر نکال دیا تھا۔ انہوں نے جنیوا سے چند گھنٹے کی مسافت پر ایک خوبصورت وادی کے قریب حویلی نما مکان خرید کر رہنا شروع کر دیا تھا۔

اس مکان کا نام، انہوں نے امریکیوں پر طنز کرنے کیلئے ”وائٹ ہاؤس“ رکھ دیا تھا اور اس کے بیرونی حصے کی ساخت بھی وائٹ ہاؤس جیسی ہی کر لی تھی۔ مزاحیہ اداکار اور ڈائرکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک زبردست طنز و مزاح نگار بھی تھے۔ ان کے اس اقدام میں امریکیوں کیلئے پیغام پوشیدہ تھا کہ تم اپنا وائٹ ہاؤس اپنے پاس رکھو، میں نے اپنا ذاتی وائٹ ہاؤس بنا لیا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اس بے مثل کامیڈین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور انہوں نے ہمارے وفد کو ایک غیر رسمی ملاقات کیلئے اپنی حویلی میں مدعو کر لیا تھا۔

میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ رہا تھا تو میں نے چارلی چپلن کی دیگر فلموں کے علاوہ ان کی ”دی گریٹ ڈکٹیٹر“ بھی دیکھی تھی جس میں انہوں نے ہٹلر اور اس کے ایک ہم شکل کا ڈبل رول کیا تھا۔ وہ ہم شکل ایک یہودی حجام تھا۔ یہ فلم بلاشبہ چارلی چپلن کی اداکاری کا شاہکار تھی۔ مجھے اس کے کئی مناظر آج تک یاد ہیں۔ ہم جب چارلی چپلن کی حویلی کے سامنے بس سے اترے تو وہ خود ہمارا استقبال کرنے کیلئے گیٹ پر موجود تھے۔

میں نے انہیں، بازو اسی طرح اٹھا کر سیلیوٹ کیا جس طرح جرمن فوجی کرتے تھے، اور ”ہیل ہٹلر“ بھی کہا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں ان کی کس فلم کی نقل کر رہا ہوں۔ وہ خوب ہنسے، پھر انہوں نے بھی جواباً مجھے اسی طرح سیلیوٹ کیا اور کہا۔ ”میرے وائٹ ہاؤس میں خوش آمدید!“

مجھے پتہ چلا کہ سیاحوں کی کوئی بس جب بھی اس سڑک سے گزرتی تھی تو ڈرائیور اس حویلی کی طرف اشارہ کر کے فخریہ انداز میں انہیں بتاتا تھا کہ یہاں چارلی چپلن صاحب رہتے ہیں۔ ہم جب چارلی چپلن کے ساتھ حویلی کے مرکزی ہال سے گزرے تو وہاں شاندار اور پُروقار لباس میں، ایک خاتون بیٹھی پیانو بجا رہی تھیں۔ انہوں نے پیانو بجاتے بجاتے سر کے اشارے سے ہمیں گویا ”ہیلو“ کہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چارلی چپلن کی ”تازہ ترین“ بیوی ”اُونا“ تھیں جو مشہور ڈراما نگار یوجین اونیل کی صاحبزادی تھیں۔ قریب ہی ایک بچی کھیل رہی تھی۔ وہ غالباً چارلی چپلن اور ”اونا“ کی بیٹی تھی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

تحسین جمیل

قسط : 19

ہم سبزہ زار پر جا بیٹھے۔ چارلی چپلن جھولا جھولنے والی کرسی پر تھے اور ہم سب ان کے اردگرد گھیرا ڈال کر بیٹھے تھے۔ ہم نے دنیا بھر کے موضوعات پر ان سے باتیں کیں۔ انہوں نے گویا اپنا دل کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ راج کپور اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ وہ چارلی چپلن کے سب سے بڑے مداح..... بلکہ ان کے روحانی شاگرد تھے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی اداکاری میں چارلی چپلن کا رنگ بھی جھلکتا تھا.....

چارلی چپلن سے ہماری ملاقات تین گھنٹے پر محیط رہی، جس کے دوران نہایت بے تکلفانہ اور دوستانہ ماحول میں بہت سے موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ یہ ہم سب کے لئے ایک یادگار ملاقات تھی۔ طویل عرصے تک چارلی چپلن کی ہر بات ہمیں یاد آتی رہی۔ اس سے پہلے میری ملاقات دنیا کے ایک اور مشہور کامیڈین 'ڈینی کے' سے بھی ہو چکی تھی۔ ڈینی اقوام متحدہ کے خیر سگالی سفیر بھی تھے اور ایک بار مختصر دورے پر بمبئی آئے تھے۔ ڈینی اور چارلی میں سب سے بڑا فرق یہ محسوس کیا کہ ڈینی اسکرین سے ہٹ کر، حقیقی زندگی میں بھی ایک کامیڈین لگتا تھا جبکہ چارلی چپلن کی شخصیت اس کے بالکل الٹ تھی، جیسے وہ اسکرین پر نظر آتے تھے۔ حقیقی زندگی میں چارلی چپلن ایک سنجیدہ اور فلسفی قسم کے انسان نظر آتے تھے جس کی دنیا کے تمام معاملات پر گہری نظر تھی اور جو بہت سی باتوں پر نہایت خوبصورتی سے طنز کرنا بھی جانتا تھا۔

جب ہم رخصت ہونے کے لئے اٹھے تو چارلی چپلن باہر تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ راج کپور بس میں بیٹھنے کے بعد کھڑکی سے، آدھے باہر لٹک کر اس وقت تک ہاتھ ہلا کر چارلی کو خدا حافظ کہتے رہے جب تک بس کافی آگے نہیں نکل گئی اور چارلی ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

پراگ میں چند افسر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان میں سے دو کی شخصیت مجھے بالکل الگ تھلگ اور نمایاں محسوس ہوئی۔ ان میں سے ایک مرد تھا جو اپنے نین نقش، چہرے کی سختی اور نیلی آنکھوں کی سفاکی کی وجہ سے پہلی نظر میں کوئی پیشہ ور قاتل دکھائی دیا۔ دوسری ایک نہایت اسمارٹ اور حسین لڑکی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس بائیس سال ہوگی۔ وہ اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا تو شاید فوراً ہی اس سے شادی کی درخواست کر دیتا اور اگر وہ مان جاتی تو اسے بیاہ کروا کر واپسی پر اپنے ساتھ انڈیا لے جاتا۔

اس کا نام الینا تھا۔ پراگ میں مختصر قیام کے دوران مجھے اس کے ساتھ ڈانس کرنے کا موقع ملا۔ اس ڈانس کے ساتھ گویا کچھ نادیدہ آنکھیں مسلسل ہماری نگرانی کرتی رہیں، جن میں شاید اس شخص کی آنکھیں بھی شامل تھیں جو پہلی نظر میں مجھے ایک سفاک قاتل معلوم ہوا تھا، لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ تو نہایت نرمی سے گفتگو کرنے والا ایک شائستہ اور مہذب انسان تھا۔

ماسکو کے فلمی میلے کے سلسلے میں روس میں اپنے چھ ہفتے کے قیام کے دوران ہم نے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا۔ میری دو فلمیں ''آندھیاں'' اور ''راہی'' انگریزی اور روسی ترجمے کی عبارت کے ساتھ فیسٹیول میں شریک تھیں اور بہت سے شہروں کے سینما گھروں میں بھی ریلیز کی گئی تھیں۔ ان کے 800 پرنٹس تیار کئے گئے تھے۔ ہمیں اپنی پسند کے کئی شہروں میں جا کر گھومنے پھرنے کی اجازت دی گئی تھی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے مترجم بھی مہیا کیے گئے تھے۔

روسیوں کا رویہ ہمارے ساتھ بے حد دوستانہ تھا۔ طویل مدت کی پابندیوں کے بعد ہم پہلے غیر ملکی تھے جنہوں نے اس دوستانہ فضا میں روس کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، تاہم یہ احساس ہر جگہ ہی ہمارے ساتھ رہا کہ کچھ نادیدہ آنکھیں ہماری نگرانی کرتی تھیں۔ جو لڑکیاں نہایت اشتیاق سے ایک شام کسی پارٹی میں میرے ساتھ ڈانس کرتیں، وہ اس کے بعد دوبارہ نظر نہ آتیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم جن لوگوں سے بھی ملتے تھے، انہیں ہم سے زیادہ میل ملاپ بڑھانے کی اجازت نہیں تھی۔

روس کے لوگ صرف اپنی وزارت ثقافت کی تیار کردہ فلمیں دیکھنے کے عادی تھے۔ وہاں ہر چیز سرکاری تحویل میں تھی۔ ہماری فلمیں ان کے لئے گویا تازہ ہوا کا جھونکا تھیں۔ راج کپور وہاں سب سے زیادہ مقبول ہوئے، ان کی فلم ''آوارہ'' کے گانے ''آوارہ ہوں.....'' کا پہلا بول تو روسیوں نے بھی سیکھ لیا اور ہر جگہ لوگ ہمیں اس طرح دہراتے ہوئے ملے جیسے وہ ان کا قومی ترانہ ہو۔ کتنی ہی جگہوں پر راج کپور سے اس گانے کی فرمائش کی گئی اور انہوں نے خوب مزے لے لے کر سنایا۔ وہ جہاں بھی پیانو پر یہ گانا سناتے، لوگ خوشی سے گویا دیوانے ہو جاتے۔

اس کے کچھ عرصے بعد بھارت کے پہلے وزیراعظم پنڈت نہرو روس کے دورے پر گئے تو اس وقت تک لوگ وہاں راج کپور کو یاد کر رہے تھے۔ پنڈت نہرو راج کپور کی مقبولیت کا اندازہ کر کے حیران رہ گئے۔ ایک جگہ تو ان سے کسی نے پوچھ لیا۔ ''کیا آپ اسی ملک کے وزیراعظم ہیں جہاں 'آوارہ' رہتا ہے؟''

پنڈت نہرو کے لئے بھی سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ 'آوارہ' سے اس کی مراد راج کپور تھی۔ وہ راج کپور کی مقبولیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ماسکو میں 'راج کپور کمپلیکس' تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ کئی سال بعد مجھے دوبارہ روس جانے کا موقع ملا۔ اس وقت میں ماسکو فلم فیسٹیول کی جیوری میں شامل تھا۔ مشہور امریکی فلم ڈائریکٹر کنگ وڈور اس جیوری کا سربراہ تھا۔ اسی دوران امریکی خلاباز نیل آرمسٹرانگ نے پہلی بار چاند پر قدم رکھا۔ یہ خبر جب ٹی وی پر چلی تو میں نے امریکی وفد کے چہروں پر جو فاتحانہ مسکراہٹ دیکھی اور روسیوں نے جس طرح قدرے کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی سبقت کو تسلیم کیا، وہ بھی میرے لئے ایک دلچسپ مشاہدہ تھا۔ امریکا اور روس کے درمیان اس امر پر بھی زبردست مقابلہ جاری تھا کہ ان میں سے کس کا خلاباز پہلے چاند پر پہنچتا ہے۔ امریکا اس دوڑ میں جیت گیا تھا۔

ہم روس سے واپس آئے تو میرے بڑے بھائی چیتن فلمیں بنانے کے سلسلے میں ایک نئے جوش و خروش سے بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ''فنٹوش'' کے نام سے ایک کامیڈی فلم بنائی جس میں کام کرتے ہوئے میں بے حد لطف اندوز ہوا۔ تاہم میں محسوس کر رہا تھا کہ ''ٹیکسی ڈرائیور'' کی کامیابی کے بعد سے چیتن اپنے لئے کوئی الگ راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ شاید انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ میرے ساتھ بندھ کر رہ گئے ہیں، انہیں فلم میرے لئے بنانی پڑتی ہے۔ کمپنی چونکہ میں نے قائم کی تھی اور میں نے اس کے لئے سرمایہ فراہم کیا تھا اور باکس آفس پر روز بہ روز میرا نام بھی زیادہ مستحکم ہو رہا تھا، اس لئے وہ کاروباری طور پر مجھے کاسٹ کرنے اور اخلاقی طور پر میری بات کو زیادہ اہمیت دینے پر مجبور تھے۔

شاید یہ رفاقت اور پارٹنرشپ انہیں بوجھ محسوس ہونے لگی ہو اور وہ محسوس کرتے ہوں کہ اس بوجھ سے آزاد ہو کر وہ تنہا، اپنی ذاتی حیثیت میں اپنی صلاحیتوں کا بہتر اظہار کر سکتے تھے۔ اس طرح کے خیالات دل میں آنا ایک فطری سی بات تھی۔ میں شاید اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کئے رہتا لیکن اتفاق سے ایک دن ایک خط پر میری نظر پڑ گئی۔ میں دوسروں کے خط پڑھنے کو ایک معیوب حرکت سمجھتا ہوں، خواہ وہ

آپ کے قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس خط پر اتفاق سے ہی میری نظر پڑ گئی تھی۔

وہ میرے بھائی نے اپنی بیوی کے نام لکھا تھا لیکن شاید انہیں اس کے لئے لفافہ نہیں ملا تھا اور وہ اسے میز پر ہی بھول گئے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر وہ کھلا ہی پڑا تھا۔ میری نظر صرف ان سطور پر پڑی جن میں چیتن نے لکھا تھا ''..... میں اس کمپنی میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن دیو آنند میرے لئے مسئلہ ہے.....''

میں نے اس سے آگے کچھ پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان الفاظ سے میرا دل بہت دکھا۔ میں نے اپنے فارغ بیٹھے ہوئے جس بھائی کو کام پر لگانے اور اسے سہارا دینے کے لئے کمپنی بنائی تھی اور اس کے لئے اپنے پروڈیوسر سے رقم ایڈوانس کے طور پر مانگ کر لایا تھا، اس کے لئے آج میں ''مسئلہ'' بن گیا تھا۔ ایک حساس انسان کی حیثیت سے مجھے اس بات سے دکھ پہنچا لیکن ایک حقیقت پسند انسان کے طور پر میں نے دل ہی دل میں اس بات کو قبول کر لیا، چنانچہ جب چیتن کے دل کی یہ بات اس کی زبان پر آئی اور ہم اس موضوع پر بات کرنے کے لئے آمنے سامنے بیٹھے تو مجھے صدمہ یا حیرت نہیں ہوئی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر چپکے چپکے اپنی الگ کمپنی بنانے اور آزاد حیثیت میں کام کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا، جس کی وجہ سے ''نوکیتن'' پر اس کی مکمل توجہ بھی نہیں تھی۔ میں نے فوراً اپنے چھوٹے بھائی گولڈی کو اس کا متبادل بنا لیا۔ گولڈی نے ''ٹیکسی ڈرائیور'' جیسی کامیاب فلم کا اسکرپٹ لکھا تھا اور ''فنٹوش'' کی تیاری کے دوران جزوی طور پر ڈائریکٹر کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ اس کے پاس ایک نیا اسکرپٹ بھی تیار تھا۔ میں نے اپنی کمپنی میں چیتن کی جگہ فوراً اسے شامل کر لیا۔ ہم نے ''نو دو گیارہ'' کے نام سے نئی فلم شروع کی جس میں مونا میرے مقابل ہیروئن تھی۔

''نو دو گیارہ'' ہائی وے پر مسلسل سفر کی کہانی تھی جس کے دوران ہمیں ہر طرح کے علاقوں..... اور خاص طور پر دیہی علاقوں سے گزرنا تھا۔ میں اس فلم میں ٹرک ڈرائیور تھا۔ اس فلم کے یونٹ کا سفر اور شوٹنگ، دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ تھیں اور دونوں کامیابی سے آگے بڑھتی رہیں، جس کے دوران ہم چمبل کے جنگلات کے قریب بھی پہنچ گئے جو انڈیا میں ڈاکوؤں کی سب سے بڑی پناہ گاہ کے طور پر مشہور ہیں۔

وہاں ہمارے قیام کے دوران ایک رات ایک مخبر خبر لایا کہ کل ہماری شوٹنگ کے دوران ڈاکو ہمیں لوٹنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نہ جانے کیوں کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار رہا اور میں نے آگے بڑھنے یا شوٹنگ کینسل کرنے کا بالکل نہیں سوچا۔ دوسرے روز ہم سڑک کے کنارے دیہاتی دکانوں اور 'ڈھابوں' وغیرہ کے سین شوٹ کر رہے تھے کہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ آن پہنچا۔

میں خوفزدہ ہونے کے بجائے ٹرک کے اوپر چڑھ گیا۔ میں نے بلند آواز میں اس طرح انہیں مخاطب کیا جیسے کوئی سیاسی لیڈر جلسے سے خطاب کر رہا ہو۔

''کیا حال ہیں میرے دیس کے باسیو..... میرے بھائیو.....''

ایک لمحے کے لئے دوسری طرف سناٹا رہا، پھر ایک بھاری بھرکم سا بندوق بردار آدمی، جو ڈاکوؤں کا سردار معلوم ہوتا تھا، گونجیلی اور حیرت زدہ سی آواز میں بولا۔

''ارے..... دیو آنند صاحب..... آپ.....؟''

''ہاں..... بھائی..... میں یہاں شوٹنگ کے ارادے سے آیا تھا لیکن سنا ہے کہ کچھ لوگ ہمیں لوٹنے آ رہے ہیں۔ اس لئے اب آگے جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''ارے..... نہیں..... دیو صاحب! آپ بے فکری سے اپنی شوٹنگ چالو رکھیے۔ ہم تو صرف آپ کے درشن کے لئے آئے ہیں۔'' وہ بولا۔

تب میں نے ٹرک سے اتر کر باری باری ان سب کے ساتھ گرمجوشی سے معانقہ اور مصافحہ کیا۔ وہ سب میرے ساتھ تصویریں بنوانے لگے۔ اتنے میں گاؤں کی طرف سے، کچے میدان میں ایک چٹاخہ پٹاخہ سی دیہاتی لڑکی دوڑتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ وہ سب کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

قریب آ کر اس نے اپنی چولی سے ایک چھوٹا سا کیمرہ نکالا اور ایک آدمی کو دے کر ہانپتے ہوئے بولی۔ ''پہلے دیو صاحب کے ساتھ میری تصویر بناؤ۔''

اس نے اپنا ایک بازو بے تکلفی سے میرے گلے میں حمائل کر دیا اور پوز بنا کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے بھی اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ اس کے انداز و اطوار اور ڈاکوؤں کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت اچھی طرح شناسا تھی اور ان کے سردار کی..... یا پھر شاید سب ہی کی مشترکہ محبوبہ تھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

مدھوبالا

اپنے دکھ چھپائے ہمیشہ ہنستی نظر آئی

قسط : 20

''نو دو گیارہ'' کے ریلیز ہوتے ہی ہم نے اس سے اگلی فلم ''کالا پانی'' کی تیاری شروع کر دی۔ اس فلم کی ڈائریکشن کی ذمے داری میں نے راج کھوسلہ کو سونپی۔ وہ میرا اس زمانے کا دوست تھا جب میں انگریز سرکار کے قائم کردہ سنسر کے محکمے میں ملازم تھا اور ڈاک سنسر کرنے والے عملے میں شامل تھا۔ راج کھوسلہ سے اس زمانے میں کافی ہاؤس میں میری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کی آواز بھاری اور گونجیلی تھی۔

اسے اصل میں تو گلوکار بننے کا شوق تھا اور وہ کے۔ ایل سہگل کا زبردست پرستار تھا۔ تاہم میں نے اسے ڈائریکٹر بننے کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ گرودت جن دنوں میری فلم ''بازی'' ڈائریکٹ کر رہا تھا، ان دنوں میں نے راج کھوسلہ کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ گرودت نے اس سے اسسٹنٹ کے طور پر کام لیا تھا۔ درحقیقت وہیں سے اس کے فلمی کیریئر کا آغاز ہوا تھا اور آگے چل کر وہ ایک کامیاب ڈائریکٹر ثابت ہوا جس نے انڈین فلم انڈسٹری کو کئی شاندار اور یادگار فلمیں دیں۔ میری اس کے ساتھ ایک طویل اور خوشگوار رفاقت رہی۔

وہ اکثر، بغیر اطلاع دیے میرے ہاں آ جاتا اور ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتا۔ وہ ایسے گانے گاتا جن سے صرف میں ہی نہیں، وہ خود بھی لطف اندوز ہوتا۔ گانے کے دوران وہ اپنا بریف کیس کھولتا جو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس بریف کیس میں اس کے کاغذات اور دیگر ضروری چیزوں کے علاوہ شراب کی ایک چپٹی بوتل بھی ہوتی تھی۔ گانے کے دوران جلد ہی وہ مرحلہ آ جاتا کہ وہ وقفے وقفے سے اس بوتل سے گھونٹ بھرنے لگتا۔ میرے خیال میں شراب کی لت ہی اس کی موت کا باعث بنی۔

''کالا پانی'' میرے لئے کئی پہلوؤں سے یادگار فلم تھی۔ ایک تو اس فلم پر مجھے پہلی بار بہترین اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ میرے ساتھ اسی فلم پر نلنی جیونت کو بہترین معاون اداکارہ کا ایوارڈ ملا۔ ہمیں ایوارڈز اس وقت کے، مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے ہاتھ سے ملے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس فلم کی شوٹنگ دیکھنے کیلئے انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو بھی اسٹوڈیو آئے۔ ہمیں جب ان کی آمد کی اطلاع ملی تو ہم سین شوٹ کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر کے ان کا انتظار کرنے لگے۔

دیو آنند اپنے بھائی چیتن کے ساتھ فلم ''ہمسفر'' کے سیٹ پر

صدر سوئیکارنو اپنے دیئے ہوئے وقت کے دو گھنٹے بعد تک اسٹوڈیو نہیں پہنچے تو ہم سب لوگوں کو تھوڑا سا غصہ آیا اور ہمیں جتنی شوٹنگ کرنی تھی، وہ ہم نے کر ڈالی۔ اسی دوران اطلاع ملی کہ صدر سوئیکارنو اسٹوڈیو پہنچ گئے ہیں۔ صدر اپنے وفد سمیت سیٹ پر پہنچے تو انہوں نے دیر سے آنے پر معذرت کی۔ انہیں کوئی مسئلہ آن پڑا تھا جس کی وجہ سے وہ طے شدہ پروگرام سے لیٹ ہو گئے۔ ان کی آمد اور معذرت کے بعد مجھ میں ایک نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا اور میں نے وہ شاٹس دوبارہ پکچرائز کرا دیئے جو میں پہلے بھی کرا چکا تھا۔ وہ مجھ پر پکچرائز ہونے والے اس مشہور گانے کے شاٹس تھے:

ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے

انڈونیشیا کے صدر ہماری شوٹنگ دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوئے اور انہوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی۔ ہمارے لئے ان کی آمد بھی بلاشبہ ایک اہم واقعہ تھی لیکن فلم ''کالا پانی'' کے حوالے سے میری سب سے زیادہ یادیں مدھوبالا سے وابستہ ہیں جو اس فلم میں میرے مقابل ہیروئن تھی۔ وہ پری چہرہ اور معصوم صورت لڑکی بہت ہی ہنس مکھ تھی۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھی اور اس کی ہنسی بہت ہی بے ساختہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو شوٹنگ کے دوران اس کی ہنسی چھوٹ جاتی تو رکنے میں نہ آتی اور اس کے لئے شاٹ دینا مشکل ہو جاتا۔

اس وقت ہمیں گمان تک نہیں تھا کہ ہر وقت ہنسنے والی اس لڑکی کے دل میں سوراخ ہے اور وہ اپنے سینے میں نہ جانے کتنے دکھ چھپائے جی رہی ہے۔ ہمیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی آئندہ زندگی میں کیا کیا محرومیاں اور دکھ آئیں گے۔ عین ممکن ہے وہ اس دنیا پر..... اور ہم سب پر ہنستی ہو..... شاید وہ ہم سب کی بے خبری اور کم علمی پر ہنستی ہو، ہمیں کیا خبر تھی، وہ جوانی میں مر جائے گی اور اپنے پیچھے ان گنت داستانیں اور دکھ دینے والی یادیں چھوڑ جائے گی۔

o.....o.....o

ہمارا پہلا بچہ سنیل سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورخ کے ایک نرسنگ ہوم میں پیدا ہوا تھا۔ ہم میاں بیوی کو چیکوسلواکیہ کے فلم فیسٹیول میں مدعو کیا گیا تھا۔ کچھ وجوہ کی بنا پر میں نے مونا کو کافی دن پہلے سوئٹزرلینڈ روانہ کر دیا تھا۔ میں ان دنوں اپنی فلم ''پے انگ گیسٹ'' کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ میں شوٹنگ سے فارغ ہو کر زیورخ پہنچوں گا۔ وہاں سے ہم فلم فیسٹیول میں شرکت کے لئے چیکوسلواکیہ جائیں گے۔

اس پروگرام پر عمل ہوا اور پندرہ دن بعد میں مونا کے پاس زیورخ پہنچ گیا۔ وہاں سے ہم فلم فیسٹیول میں شرکت کے لئے چیکوسلواکیہ آئے تو ہمارے ساتھ تیسرا مہمان سنیل بھی تھا جس کی عمر صرف دو ہفتے تھی۔ ہم ہر جگہ اسے اپنے ساتھ ایک باسکٹ میں اٹھائے پھرتے۔ فیسٹیول کے تمام مہمان راستے میں رک رک کر حیرت سے ہمارے بچے کو دیکھتے اور بعض اسے پیار کرتے۔ فیسٹیول چھوٹے سے ایک خوبصورت شہر ''کارلووی واری'' میں ہو رہا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام ''کارلووی واری فلم فیسٹیول'' تھا۔ یہ شہر اپنی خوبصورتی کے علاوہ گرم پانی کے چشموں کے لئے مشہور تھا۔

فیسٹیول میں سفید داڑھی والے ایک مندوب بھی تھے جن کی عمر 86 سال تھی۔ پریس رپورٹر وہاں اکثر کسی دلچسپ خبر کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی نے ان 86 سالہ مندوب کی سنیل کے ساتھ تصویر بنائی جو دوسرے روز اس کیپشن کے ساتھ اخبار میں چھپی ''فیسٹیول کے سب سے کم عمر اور سب سے زیادہ عمر کے مہمان۔''

یہ اخبار الینا میرے پاس لے آئی۔ الینا وہی خوبصورت لڑکی تھی، جس نے دو سال پہلے میرے لئے، روس اور چیکوسلواکیہ کے دورے کے وقت ہمارے وفد کے لئے ترجمان کے فرائض انجام دیئے تھے۔ وہ اس بار بھی ہماری ترجمان تھی، وہ بھی ہمیں باسکٹ اٹھائے پھرتے دیکھ کر محظوظ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ باسکٹ ہم سے لے لیتی اور خود اسے اٹھائے پھرتی۔ اس دوران وہ سنیل سے کھیلتی اور اسے بہلاتی۔

دو سال پہلے والے دورے میں جب پراگ میں وہ ہمارے ساتھ تھی تو اس نے بتایا تھا کہ اسے انڈیا دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے لیکن ایک کمیونسٹ ملک کی شہری ہونے کی حیثیت سے وہ اکیلی ہمارے ملک کے دورے پر نہیں آ سکتی تھی۔ کمیونسٹ ملکوں کی حکومتیں، خاص طور پر اس زمانے میں اپنے شہریوں پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اگر کسی دوسرے ملک سے کوئی فرد یا ادارہ باضابطہ طور پر ان کے کسی شہری کو، ایک خاص طریقہ کار کے تحت مدعو نہ کرتا تو پھر اسے اپنے ملک سے باہر جانے کے لئے اپنی حکومت سے اجازت لینا پڑتی تھی۔

جب اس نے انڈیا آنے کے سلسلے میں اشتیاق کا اظہار کیا تھا تو میں نے اسے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا تھا۔ ''تم جیسی حسین لڑکی کو تو کوئی بھی بھارتی شہری خوشی سے مدعو کر لے گا..... لیکن اندیشہ یہ ہے کہ تمہیں واپس آنے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

''کیونکہ وہاں تمہیں بے شمار چاہنے والے مل جائیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر میں وہیں رہ جاؤں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہاں کم از کم آزادی تو ہو گی۔''

حقیقت یہ تھی کہ کمیونسٹ ملکوں میں، اس زمانے میں، وہاں کے شہریوں کا دم گھٹتا تھا اور وہ آزاد، جمہوری ممالک سے آنے والوں کو رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔

الینا نے اچانک مجھ سے پوچھ لیا۔ ''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

میں اس وقت شادی کر چکا تھا لیکن اسے راز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ الینا سے تو مجھے یہ بات چھپانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن یونہی، ایک معصومانہ اور بے مقصد سی شرارت کے تحت میں نے بات بدل دی اور الینا کے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا۔

چند لمحے بعد وہ بولی۔ ''اگر میں انڈیا آئی اور تم نے مجھے واپس نہ آنے دیا تو میں وہیں رہ جاؤں گی۔'' اس کی صاف گوئی حیرت انگیز تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جو اس کے الفاظ کی تائید کر رہی تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس خاموشی سے مسکراتا رہا۔

''میں تمہیں خط لکھوں گی۔'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کہا اور ایک ڈائری کھول کر میرے سامنے کر دی۔ میں نے اس میں اپنا ایڈریس لکھ دیا۔

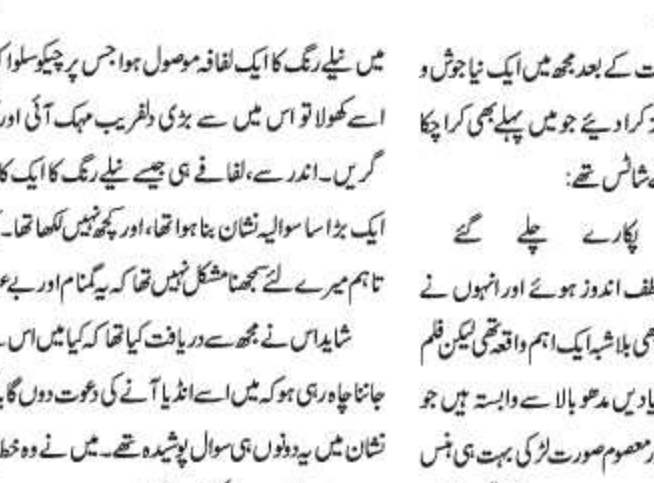

وحیدہ رحمان، راج کھوسلہ، دیو آنند اور گرودت

میرے، انڈیا واپس آنے کے تقریباً دو ماہ بعد مجھے ڈاک میں نیلے رنگ کا ایک لفافہ موصول ہوا جس پر چیکوسلواکیہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں سے بڑی دلفریب مہک آئی اور گلاب کی چند پتیاں بھی باہر آ گریں۔ اندر سے، لفافے ہی جیسے نیلے رنگ کا ایک کاغذ برآمد ہوا لیکن اس پر صرف ایک بڑا سا سوالیہ نشان بنا ہوا تھا، اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ بھیجنے والے کا نام بھی نہیں تھا۔ تاہم میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ گمنام اور بے عبارت خط الینا کا تھا۔

شاید اس نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا میں اس سے شادی کروں گا؟ ممکن ہے وہ جاننا چاہ رہی ہو کہ میں اسے انڈیا آنے کی دعوت دوں گا یا نہیں؟ یا پھر شاید اس کے سوالیہ نشان میں یہ دونوں ہی سوال پوشیدہ تھے۔ میں نے وہ خط اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا اور چند دن بعد میں اسے بالکل بھول گیا۔

اب دو سال بعد 'کارلووی واری' میں دوبارہ الینا سے ملاقات ہوئی تو پہلے دورے کی تمام باتیں اور وہ خط مجھے یاد آ گیا۔ ایک روز جب ہم ایک جگہ کھڑے تھے اور آس پاس کوئی نہیں تھا تو میں نے اس خط کی بات چھیڑی جو صرف ایک سوالیہ نشان پر مشتمل تھا۔ اس نے تصدیق کی کہ وہ خط اسی نے بھیجا تھا لیکن ساتھ ہی معذرت بھی کی اور کہا کہ اسے معلوم نہیں تھا، میں شادی شدہ ہوں، ورنہ وہ کبھی اس طرح کا خط نہ بھیجتی۔

تب شاید میں نے اپنے اندر کے مرد کو تسکین دینے کے لئے پوچھ لیا۔ ''کیا تم نے کبھی سوچا کہ کاش میں شادی شدہ نہ ہوتا؟''

''ہاں..... میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی۔'' اس نے اعتراف کر لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں میرے لئے محبت تھی، چاہ اور طلب تھی۔ میرے اندر کے مرد کو اس سے ایک بے عنوان سی خوشی محسوس ہوئی۔ اسی دوران الینا کو کہیں سے بلاوا آ گیا اور وہ مجھ سے معذرت کر کے رخصت ہو گئی۔

مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ اس سے میری یہ ملاقات میرے لئے مصیبت بن جائے گی اور الینا سے بات کر کے میرے اندر کے مرد کو جو چھوٹی سی خوشی ملی ہے وہ مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ میں جب اپنے ہوٹل کے سوئٹ میں واپس پہنچا تو مونا وہاں منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

''وہ لڑکی کون تھی؟'' اس نے لڑاکا بیویوں والے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''کون سی لڑکی؟'' میں نے سادگی سے پوچھا، فوری طور پر واقعی میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس لڑکی کی بات کر رہی تھی۔

''اتنے انجان مت بنو، میں اسی حسین لڑکی کی بات کر رہی ہوں، جس سے تم تھوڑی دیر پہلے، باہر کھڑے بات کر رہے تھے۔'' مونا کی آواز بلند ہو گئی۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے وہ ہماری مترجم ہے۔'' میں نے کہا۔

''جھوٹ مت بولو..... تمہارا اس سے کوئی خاص تعلق ہے..... اور تم بہت پہلے سے اسے جانتے ہو.....'' مونا باقاعدہ چیخنے لگی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی آواز باہر تک جا رہی ہو گی۔ ہوٹل کی راہداریوں میں ہر وقت فیسٹیول کے مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

میں فلم کی ٹکٹیں بلیک کر رہا تھا

تمکین تبسم

قسط : 21

میں نے مونا کو سمجھانے بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا غصہ کم نہ ہوا اور وہ چیختی چلاتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ میرے اور الینا کے درمیان گہرا تعلق ہے اور شاید عشق کا چکر چل رہا ہے۔ ہمارے اس جھگڑے کا انجام نہ جانے کیا ہوتا لیکن اسی دوران باسکٹ میں لیٹا ہوا ہمارا ننھا منا سنیل بیدار ہو گیا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنا جھگڑا بھول کر، لپک کر اس کے پاس پہنچے۔ ہم دونوں نے جھک کر اسے دیکھا تو وہ رونا بھول گیا اور مسکرا کر ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا لیکن مونا نے فوراً ہی اسے مجھ سے لے لیا۔ وہ اس سے کھیلنے لگی اور توتلی زبان میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ ایک لمحے میں اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اب اس کے چہرے پر ممتا کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ہم چیکوسلواکیہ سے واپس آئے تو بمبئی کے سانتا کروز ایئرپورٹ پر نوکیتن کمپنی کے تمام لوگ ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ میری غیر موجودگی میں میری تازہ ترین فلم ''سی آئی ڈی'' ہٹ ہو چکی تھی۔ سب لوگ بہت خوش تھے اور پردیس میں پیدا ہونے والے سنیل کو دیکھنے کیلئے بے تاب اور متجسس بھی تھے۔ اس کے تین سال بعد ہمارے ہاں بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام ہم نے دیوینا رکھا۔ یہ میرے ہی نام..... یعنی ''دیو آنند'' سے بنایا گیا تھا۔ یوں تو سنیل بھی ہماری آنکھوں کا تارا تھا لیکن دیوینا تو ہمیں اور بھی زیادہ عزیز رہی۔ خاص طور پر میں تو اس کی معمولی سی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتا تھا اور وہ بھی بہت ہی چھوٹی عمر سے گویا ہر وقت میری گود میں رہنا چاہتی تھی۔

اب ایک اسٹار کے طور پر میرا مقام مستحکم ہو چکا تھا اور اسٹار بننے کے بعد انسان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ایک عام انسان کو ایک نظر دیکھنے کے بعد کوئی اس کی طرف دوبارہ نہیں دیکھتا لیکن ایک اسٹار گویا ہر وقت دنیا کی نظر میں رہتا ہے۔ لوگ اس کی ہر حرکت، ہر مصروفیت اور تمام معمولات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ وہ کیا کھاتا ہے، کیا پیتا ہے، بیڈ روم میں کب جاتا ہے اور کس کے ساتھ جاتا ہے..... غرضیکہ لوگ اس کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی، ہر بات جاننا چاہتے ہیں۔

شاید بے شمار لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کی وجہ سے خود اسٹار کی زندگی اور اس کے انداز فکر میں بھی کچھ تبدیلی آ جاتی ہے۔ وہ اپنا معیار زندگی اونچا کرنا چاہتا ہے اور اپنا رہن سہن شاندار بنانا چاہتا ہے۔ شاید اسی لئے عموماً جب کسی اداکار یا اداکارہ کی دو چار فلمیں ہٹ ہو جاتی ہیں تو وہ کسی شاندار اور کشادہ مکان میں شفٹ ہو جاتی ہے، اچھی اور مہنگی گاڑی خرید لیتی ہے۔ خواہ ان کاموں میں ان اسٹارز کو دشواری پیش آئے لیکن وہ زیادہ تر ایسا ضرور کرتے ہیں۔

میں جب اسٹار بنا تو میں نے نیا بنگلا تو نہیں خریدا البتہ اپنے ایک منزلہ بنگلے کو دو منزلہ بنوا لیا۔ اب اس کی بالائی منزل پر ایک ایسے کمرے کا بھی اضافہ ہو گیا جس کی ایک کھڑکی سے طلوع آفتاب کا اور دوسری کھڑکی سے غروب آفتاب کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مجھے جب بھی اپنی مصروفیات میں سے وقت ملتا، میں اسی کمرے میں بیٹھ کر سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتا۔

پران، منوج کمار اور دیو آنند

ایک روز میں اسی کمرے میں بیٹھا غروب آفتاب کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایک عزیز دوست کا فون آ گیا۔ اس نے کافی عرصے بعد فون کیا تھا۔ یہ عزیز دوست سنیل دت تھا جس کا نام پہلے بلراج ہوا کرتا تھا مگر اس نے اپنا فلمی نام سنیل دت رکھ لیا تھا۔ وہ بھی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو ''گرائیں'' کہتے تھے۔ پنجاب میں ایک ہی جگہ کے رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو 'گرائیں' کہتے ہیں۔ سنیل دت اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا لیکن اب چونکہ اسے ہمارے ہاں آئے کافی دن گزر گئے تھے، اس لئے مجھے فون پر اس کی آواز سن کر پہلے سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ وہ ان دنوں اس فلم میں کام کر رہا تھا جو نہ صرف انڈیا کی فلمی تاریخ کا اہم حصہ بن گئی بلکہ اس نے نرگس اور سنیل دت کو بھی بڑے اداکاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ فلم تھی ''مدر انڈیا''۔

''اتنے دنوں سے تم ہم سے ملنے کیوں نہیں آئے؟'' میں نے شکوہ کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر حکم دیا۔ ''فوراً آ جاؤ۔''

ہم اپنے بنگلے کی دوسری منزل بننے کے دوران عارضی طور پر ایک اور جگہ کرائے پر شفٹ ہو گئے تھے۔ دوسری منزل بننے کے بعد ہم اپنے گھر میں واپس بھی آ چکے تھے۔ اس عرصے میں اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

وہ بولا ''میں آ رہا ہوں۔ آج رات ٹھیک بارہ بجے ہم تمہارے گیٹ پر ہوں گے۔''

اس نے لفظ ''ہم'' استعمال کیا تھا، جس پر میں نے چونک کر پوچھا ''ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تمہارے ساتھ اور کون ہوگا؟''

''خود ہی دیکھ لینا۔'' اس نے شرارت بھرے لہجے میں یہ کہہ کر میرا تجسس کچھ اور بڑھا دیا لیکن اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، اس نے فون بند کر دیا۔

اس رات واقعی ٹھیک بارہ بجے میرے گھر کی کال بیل بجی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا۔ وہاں سنیل دت اور نرگس کھڑے تھے۔ سنیل دت کی آمد تو میرے لئے متوقع ہی تھی۔ نرگس کو دیکھ کر البتہ مجھے حیرت ہوئی۔

''نرگس..... تم.....؟'' میں نے اپنی حیرت کا اظہار بھی کر دیا۔

''یہ اب میری بیوی ہے۔ ہم نے شادی کر لی ہے۔'' سنیل دت نے مسرت بھرے لہجے میں بتایا۔

سنیل دت یہ خبر سب سے پہلے مجھے اور مونا کو سنانے آیا تھا۔ نرگس میرے ساتھ بھی ایک فلم میں کام کر چکی تھی۔

''تم بڑے اچھے موقع پر آئے۔'' میں نے سنیل دت سے کہا ''کل رات پاکستان سے میرے ہاں مشہور قوال فتح علی خان آ رہے ہیں۔ قوالی کی محفل ہوگی۔ ہم اس محفل کو تمہاری شادی کی خوشی کی تقریب میں بدل دیں گے۔ میں نئے سرے سے مہمانوں کی فہرست بناتا ہوں۔''

نرگس اور سنیل دت کو یہ تجویز پسند تو بہت آئی لیکن وہ کچھ اور پروگرام بنا چکے تھے۔ چنانچہ ہماری محفل خالص قوالی ہی کی محفل رہی اور قوالی سے شغف رکھنے والے ہی اس میں جمع ہوئے۔ فتح علی خان کے ساتھ ان کی قوال پارٹی کے علاوہ ان کا کم عمر بھتیجا بھی تھا جس نے آگے چل کر دنیا میں نصرت فتح علی خان کے نام سے شہرت کمائی۔

بہت برسوں بعد، جب نصرت فتح علی خان بہت مشہور ہو چکے تھے تو ایک ایوارڈ کی تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں یاد ہے، وہ بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ میرے ہاں ایک محفل میں آئے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں بہت اچھی طرح وہ محفل یاد ہے اور وہ بڑے اشتیاق سے اپنے چچا کے ساتھ میرے ہاں آئے تھے، کیونکہ ان کے چچا اکثر فخر سے ذکر کرتے تھے کہ ان کی قوالی کی زیادہ تر یادگار محفلیں انڈیا کے مشہور فلم اسٹار دیو آنند کے گھر پہ ہوئی ہیں۔

ظاہر ہے، مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔

☆.....☆.....☆

''مدر انڈیا'' کا پریمیئر شو لبرٹی سینما میں ہو رہا تھا۔ ٹکٹیں ختم ہو چکی تھیں لیکن فلم دیکھنے کے خواہشمندوں کا بہت بڑا ہجوم ان کھڑکیوں کے سامنے موجود تھا جہاں سے ٹکٹیں ملتی تھیں۔ بہت سے فلم اسٹارز بھی پریمیئر شو میں مدعو تھے جو یکے بعد دیگرے اپنی گاڑیوں میں وہاں پہنچ رہے تھے۔ اس موقع پر ٹکٹوں کی بلیک بھی جاری تھی۔ دو روپے والا ٹکٹ چار روپے میں اور پانچ روپے والا دس روپے میں مل رہا تھا۔ ٹکٹیں بلیک کرنے والے وہاں ڈیوٹی پر موجود پولیس والوں سے بچتے بچاتے، ان لوگوں کے درمیان آوازیں لگاتے پھر رہے تھے جو ٹکٹیں نہ ملنے کی وجہ سے مایوس کھڑے تھے۔ ''دو والی چار میں..... پانچ والی دس میں.....''

کشور کمار کے ساتھ

میں ٹکٹیں بلیک کرنے والے ان لوگوں کا سردار تھا اور شائقین کو ٹکٹیں بلیک میں خریدنے کیلئے گھیر رہا تھا۔ جونہی کوئی فلمی ہیرو یا ہیروئن اپنی گاڑی میں وہاں پہنچتی تو میں اس کے قریب بھی پہنچ جاتا لیکن اپنا دھندا جاری رکھتا۔ درحقیقت یہ میری آنے والی فلم ''کالا بازار'' کا افتتاحی سین تھا جس میں، میں اسی قسم کے دھندے کرنے والے کا رول کر رہا تھا۔

میری دیگر کئی فلموں کی طرح اس میں بھی میرا کردار منفی تھا لیکن میرے یہ منفی کردار ایسے ہوتے تھے جن میں برائیاں کم اور اچھائیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ میں نے اپنی کئی فلموں میں اسی قسم کے ہیرو کا رول کیا ہے۔ ''کالا بازار'' میں بھی میرے بھائی وجے آنند عرف گولڈی نے میرے لئے کچھ اسی قسم کا رول لکھا تھا اور بطور ڈائریکٹر اس نے افتتاحی سین حقیقی لوکیشن پر شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے نتیجے میں اس وقت میں ''مدر انڈیا'' کے حقیقی پریمیئر شو پر ٹکٹیں بلیک کر رہا تھا اور گولڈی یہ سین شوٹ کر رہا تھا۔

''نوکیتن فلمز'' میں گولڈی بطور رائٹر اور ڈائریکٹر کامیاب رہا تھا۔ وہ میرے لئے ایک قیمتی اثاثہ بن چکا تھا۔ میں اپنے ادارے کی فلموں میں ہیرو ہوتا تھا اور ہماری کئی فلمیں کامیاب ہو چکی تھیں جنہوں نے بطور اسٹار میرا مقام مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنے ادارے کی ایسی ہی ایک فلم ''ہم دونوں'' میں میرا ڈبل رول تھا۔ ایک رول آرمی کیپٹن کا، اور دوسرا اسی کے ہمشکل میجر ورما کا تھا۔

میجر ورما کا رول کرنے کیلئے میں نے برٹش آرمی کے ایک حقیقی میجر کو ذہن میں رکھا تھا جس سے کسی زمانے میں میری پونا کے قریب ایک چھاؤنی میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ میرا یہ کردار، کہانی اور اداکاری کی مناسبت سے فوجیوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ جب مجھے چین کے قریب سرحدی علاقے سکم اور اس وقت کے بلند ترین فوجی محاذ، لداخ پر جانے کا اتفاق ہوا تو فوجی مجھے سیلوٹ کرنے لگے اور میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ ایک فوجی اسپتال میں میری ملاقات ایک فوجی سے ہوئی جس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی۔ دوسرے روز ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ مجھ سے ملاقات کا اس جوان پر اتنا مثبت اثر ہوا تھا کہ وہ ایک ٹانگ ضائع ہونے کا صدمہ بھول گیا تھا اور وقت سے پہلے ہی اسپتال سے چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔

میجر ورما کے ہمشکل کیپٹن آنند کا کردار بھی فوجیوں اور عام لوگوں میں یکساں مقبول ہوا۔ خاص طور پر اس کردار میں مجھ پر پکچرائز ہونے والے اس گانے نے لوگوں کے دلوں کو چھو لیا۔

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اُڑاتا چلا گیا

اس فلم کیلئے بطور نغمہ نگار ساحر لدھیانوی اور گلوکاروں کے طور پر لتا، محمد رفیع اور آشا بھونسلے کا یکجا ہونا یادگار رہا۔ اس فلم کا ایک اور گانا لوگوں کو آج بھی نہیں بھولا ہوگا:

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر، کہ دل ابھی بھرا نہیں

فوج سے متعلق اس فلم کے مناظر ہم نے اصل فوجی آفیسرز کی زیر نگرانی پکچرائز کئے اور فلم کی ریلیز میں محکمہ دفاع کی اجازت بھی شامل رہی۔ اس وقت کے وزیر دفاع کرشنا مینن نے اپنے کئی دوستوں، رشتے داروں اور آرمی آفیسرز کے ساتھ بیٹھ کر خود یہ فلم دیکھی۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ لندن میں انڈیا کے پہلے ہائی کمشنر مقرر ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو کے دور میں انہیں وزیر بے محکمہ بنایا گیا تھا۔ وہ جب پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہونے کیلئے بمبئی سے الیکشن لڑ رہے تھے تو فلم انڈسٹری کے لوگوں نے بھی ان کیلئے جلسے منعقد کئے تھے اور وہ بھاری اکثریت سے جیت گئے تھے۔ بعد میں انہیں وزیر دفاع بنا دیا گیا تھا۔

اپنے دور وزارت میں وہ کئی بار میرے گھر پر مہمان رہے۔ ان کی شان و شوکت، دبدبہ اور آمد کا انداز قابل دید ہوتا تھا۔ وہ زبردست مقرر تھے اور حکومت میں ان کی بڑی اہمیت تھی لیکن شمال مشرقی محاذوں پر چینیوں کے ہاتھوں ہماری فوج کی شکست کا سارا نزلہ اس سویلین پر آ گرا۔ ان کی اہمیت اور عزت گویا یکدم ختم ہو گئی اور ان پر زوال آ گیا۔ ایک چمکتا ہوا ستارہ گویا ٹوٹ کر آسمان سے زمین پر آ گرا۔

(جاری ہے)

ہولی وڈ میں یونیورسل اسٹوڈیو کے سامنے دیو آنند اور ایک پرستار

allurdupdfnovels.blogspot.com

1946–2011

دیو آنند کی داستانِ حیات

میری فلم "گائیڈ" انگریزی میں بھی بنی تھی

تمکین تبسم

قسط : 22

کافی عرصے بعد ایک روز میں اپنے بنگلے کی بالائی منزل پر کھڑکی میں کھڑا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دھوتی، کرتے میں ملبوس ایک بوڑھا اور نحیف سا آدمی ہمارے لکڑی کے گیٹ پر اپنی لاٹھی سے دستک دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بالکل تنہا تھا۔ ہمارا چوکیدار اسے بھگانے کے لئے آگے بڑھا لیکن اس لمحے میں نے اسے پہچان لیا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا اور میں نے چوکیدار کو ایک طرف ہٹا کر نہایت عزت اور تپاک سے ان کا استقبال کیا، انہیں خوش آمدید کہا۔

وہ کرشنا مینن تھے..... جن کا جلوس سرکاری پروٹوکول کے ساتھ سڑک سے گزرتا تھا تو آرمی کی گاڑیاں بھی ان کے آگے پیچھے ہوتی تھیں اور لوگ سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر دور دور سے انہیں سلام کرتے تھے۔ ان کی پرانی، کھٹارا سی کار کچھ دور کھڑی تھی جس میں ان کا ڈرائیور بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے اتر کر ان کے ساتھ گیٹ تک آنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ میرے پڑوس میں کسی سے ملنے آئے تھے۔ وہ صاحب گھر پر نہیں ملے تو میری طرف چلے آئے۔

میں نے انہیں اندر بٹھایا اور ان کی کچھ خاطر مدارت کرنا چاہی لیکن وہ جلدی میں تھے، اندر نہیں آئے۔ کچھ دنوں بعد میں نے سنا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

میری فلم "ہم دونوں" کے لئے میری نظر میں سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ اسے سرکاری طور پر 1962ء کے برلن فلم فیسٹیول میں بھیجا گیا تھا۔ میں اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ برلن پہنچا جہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران بہت تباہی ہوئی تھی۔ میلے میں برطانیہ، امریکا اور کئی یورپی ممالک سے فلمی وفود آئے ہوئے تھے۔ وہاں بہت سے مشہور فلم ڈائریکٹرز اور اسٹارز سے میری ملاقاتیں رہیں اور میں نے اس دوران اپنے آپ کو دنیا بھر کی فلم انڈسٹری کا ایک حصہ محسوس کیا۔ اداکارہ شرلے میکلین اور اداکار جمی اسٹیورٹ سے تو میری اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی۔ میری ملاقات اس دور کے نہایت معروف اور باصلاحیت، پولش نژاد امریکی ڈائریکٹر ٹیڈ ڈینی لیوسکی سے بھی ہوئی۔ نوبل انعام یافتہ اور مشہور زمانہ مصنفہ پرل ایس بک (Pearl.S.Buck) کے ساتھ مل کر اس نے ایک فلم کمپنی بنائی ہوئی تھی۔ ان کی ایک فلم نے برلن فلم فیسٹیول میں ایک ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ وہ دونوں مجھے اپنی ایک فلم میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے لیکن جب میں نے اسکرپٹ پڑھا تو مجھے وہ کردار پسند نہیں آیا جس میں وہ مجھے کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے معذرت کر لی۔

اس میلے سے واپسی پر میں لندن میں رک گیا اور مونا بمبئی چلی گئی کیونکہ وہاں بچے اکیلے تھے۔ میں لندن میں تھا تو کسی نے مجھ سے ایک انگریزی ناول "دی گائیڈ" (The Guide) کا ذکر کیا۔ ناول تو انگریزی میں تھا لیکن اس کا رائٹر ایک انڈین، آر۔ کے نارائن تھا۔ میں نے لندن کی سب سے بڑی بک شاپ پر جا کر یہ ناول طلب کیا۔ دکان میں یہ ناول موجود نہیں تھا تاہم سیلز گرل نے لندن کے اس ہوٹل کا نام وغیرہ نوٹ کر لیا جہاں میں مقیم تھا۔

دوسرے روز اس وقت میں حیران رہ گیا جب میرے ناشتہ کرنے سے پہلے ناول میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ہوٹل میں اپنے سوئٹ کی بالکونی میں بیٹھ کر ایک ہی نشست میں ناول ختم کر لیا۔ ناول مجھے پسند آیا اور مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اس پر مصنف کو ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ آر۔ کے نارائن کا نام مغرب کی ادبی دنیا میں بھی شناسا تھا۔ ناول پڑھتے ہی مجھے خیال آیا کہ اس پر بیک وقت اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں فلم بن سکتی تھی۔

میں نے فوراً پرل ایس بک کو فون کیا جو امریکا کے شہر کنکٹی کٹ کے مضافات میں اپنے فارم ہاؤس میں رہتی تھیں۔ میں نے ان سے کہا "آپ نے برلن میں جس فلم کی بات کی تھی، میں اس میں تو کام نہیں کر سکا لیکن میرا خیال ہے، ہم ایک اور پروجیکٹ کے سلسلے میں اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

انہوں نے دلچسپی ظاہر کی تو میں نے انہیں ناول "دی گائیڈ" کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے اس ناول کے بارے میں سنا ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ براڈوے کے کسی تھیٹر میں اس ناول کو ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جا چکا تھا۔ میں نے جب یہ تجویز پیش کی کہ اس ناول پر اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں فلم بن سکتی ہے، تو وہ بولیں "تم فوراً امریکا آ جاؤ۔ ہم اس سلسلے میں بات چیت کرتے ہیں۔"

میں امریکا پہنچ کر مین ہٹن کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا اور پرل ایس بک نے اپنی کار بھیج کر مجھے اپنے فارم ہاؤس پر بلوا لیا، جہاں ان کے ساتھ فلم ڈائریکٹر ٹیڈ ڈینی لیوسکی بھی میرا منتظر تھا۔ بات چیت ہوئی اور وہ دونوں اس بات پر تیار ہو گئے کہ وہ اس ناول پر انگریزی میں فلم بنائیں گے، جس کا اسکرپٹ پرل ایس بک لکھیں گی۔ ناول کے مصنف آر۔ کے نارائن سے بات چیت کرنے اور معاملات طے کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔

میں نے امریکا میں قیام کے دوران ہی نارائن کے بارے میں اپنے ذرائع سے اتا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ یہ صاحب امریکا آتے رہتے ہیں لیکن ان کا اصل گھر میسور میں ہے اور ان دنوں یہ وہیں ہیں۔ میں نے لاس اینجلس سے انہیں میسور فون کیا تو انہیں یقین نہ آیا کہ میں واقعی لاس اینجلس سے دیو آنند بول رہا ہوں اور میں نے اتنی تگ و دو سے ان کا پتا چلایا ہے۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ میں، پرل اور ٹیڈ، ان کے ناول پر دو زبانوں میں فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ انہوں نے بنا حیل حجت اپنے ناول کے بارے میں ہر اختیار مجھے دے دیا لیکن چونکہ ہولی وڈ بھی اس منصوبے میں شریک ہو رہا تھا، اس لئے ہر معاملہ تحریری شکل میں لانا ضروری تھا۔ طے پایا کہ میں جب انڈیا واپس جاؤں گا تو ان سے مل کر یہ کام کر لوں گا۔

میں جب انڈیا واپس آیا اور آر۔ کے نارائن سے میرے معاملات طے پا گئے تو اس خبر نے خاصی سنسنی پھیلائی کہ میں ہولی وڈ کی ایک کمپنی کے ساتھ مل کر بیک وقت اردو اور انگریزی میں ناول "دی گائیڈ" پر فلم بنا رہا ہوں۔ میں نے پرل ایس بک اور ٹیڈ کو بمبئی مدعو کر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ان کے اعزاز میں شاندار تقریب منعقد کی اور پریس والوں کو تمام تفصیلات بتائیں، جس کے بعد عملی طور پر کوئی کام شروع ہونے سے پہلے ہی اس فلم کے ہر طرف چرچے ہونے لگے۔

اس کی شوٹنگ بھی نہایت شان و شوکت سے شروع ہوئی۔ ہم نے ایک نیا تجربہ یہ بھی کیا کہ ایک شاٹ پہلے اردو میں چیتن کی ڈائریکشن میں لیا جاتا، پھر وہی شاٹ انگلش میں ٹیڈ کی ڈائریکشن میں کیا جاتا لیکن آگے چل کر اس کام میں دشواریاں پیش آنے لگیں۔ کچھ اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ آخر کار میں نے پہلے انگلش ورژن کو مکمل کرنے اور بعد میں اردو ورژن شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران فلم پر ہر طرف سے تنقید ہو رہی تھی اور بڑی شد و مد سے اس کی ناکامی کی پیشگوئیاں کی جا رہی تھیں۔

ان پیش گوئیوں کا محور و مرکز ایک ہی نکتہ تھا..... اور وہ یہ کہ کہانی ایک شادی شدہ انڈین عورت کی بے وفائی کے گرد گھومتی تھی۔ نقادوں اور فلمی پنڈتوں کے خیال میں انڈین سینما کی اسکرین پر ایک انڈین عورت کو، اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوتے دکھانا بہت بڑی حماقت تھی۔ پیش گوئی یہ تھی کہ انڈیا کے فلمی شائقین اس خیال کو کبھی قبول نہیں کریں گے اور محض اسی وجہ سے فلم بری طرح ناکام ہو جائے گی۔

فلمسازی کے مسائل اور پریشانیاں اپنی جگہ تھیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہ تبصرے اور پیشگوئیاں بھی مجھے پریشان کرتی رہیں، تاہم میں نے حتی الامکان صبر و سکون اور خود اعتمادی سے شوٹنگ جاری رکھی۔ پھر ہوا یہ کہ "گائیڈ" ریلیز ہوئی

اور اس نے کامیابیوں کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ بطور ڈائریکٹر وجے آنند عرف گولڈی کے نام کے ڈنکے بج گئے۔ میرے بڑے بھائی چیتن آنند اس دوران "نوکیتن فلمز" سے الگ ہو کر کسی فائنانسر کی مدد سے "حقیقت" کے نام سے فلم بنا چکے تھے۔

وہ بھی "گائیڈ" کے ساتھ ہی ریلیز ہوئی لیکن اسے کاروباری طور پر معمولی درجے کی کامیابی نصیب ہوئی، البتہ نقادوں نے اسے کافی سراہا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ "گائیڈ" کی ڈائریکشن دیتے وقت خود گولڈی بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ اسے بھی اندیشہ تھا کہ کہ فلم بری طرح فلاپ نہ ہو جائے۔ اس نے صرف بڑے بھائی کے..... یعنی میرے سامنے سعادت مندی کا ثبوت دینے کے لئے خاموشی سے ہدایت کاری کے فرائض سنبھالے تھے۔ فلم کی تکمیل کے دوران اسے بھی یہی دھڑکا لگا رہا کہ اس کی ریلیز کے ساتھ ہی ہماری کمپنی دیوالیہ نہ ہو جائے کیونکہ فلم کا بجٹ عام فلموں سے بہت زیادہ تھا لیکن اس فلم کی آمدنی اس کی لاگت سے کئی گنا زیادہ رہی۔

اسی فلم کی ریلیز کے بعد مجھے امریکا کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی طرف سے، ثقافتی وفود کے تبادلے کے پروگرام کے تحت چھ ہفتے کے دورے پر امریکا مدعو کیا گیا۔ میرا یہ دورہ میرے لئے بے حد معلوماتی، مشاہداتی اور دلچسپ رہا۔ اس دوران میں نے نہ صرف امریکی معاشرت اور ان کی فلمی دنیا کو قریب سے دیکھا، بلکہ فلم و ادب کی بہت سی مشہور زمانہ شخصیات سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی میری ملاقات پہلے ایک امدادی، ثقافتی تقریب میں ہوئی۔ وہیں انہوں نے ہمیں تین مورتی پر واقع اپنی قیام گاہ پر چلنے کی دعوت دی۔ وہ ان دنوں فالج کے حملے سے صحت یاب ہوئے تھے اور کافی کمزور دکھائی دے رہے تھے۔

اس وقت دلیپ کمار اور راج کپور بھی میرے ساتھ تھے۔ دعوت ہم تینوں کے لئے تھی۔ وہیں سے ہم تینوں ان کے قافلے میں شامل ہو کر ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ کئی موٹر سائیکلوں پر سوار، ان کے سرکاری محافظ ہمارے آگے پیچھے تھے۔ پنڈت نہرو کی قیام گاہ پر ان کی صاحبزادی اندرا گاندھی نے چائے اور لوازمات سے ہماری تواضع کی۔ اندرا اس وقت ایک شرمیلی اور کم گو سی خاتون تھیں۔

دلیپ کمار، راج کپور اور میں..... ہم تینوں کی مثلث فلمی دنیا میں "بگ تھری" کی عرفیت سے مشہور تھی۔ پنڈت نہرو گھر پر ہم تینوں سے ملاقات کر کے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاسی زندگی کی مصروفیات، تناؤ اور دباؤ نے انہیں بہت تھکا دیا تھا اور ہم سے ان کی ملاقات اس سے بہت مختلف ماحول میں وقت گزارنے کی ایک کوشش تھی۔ وہ بچوں کی طرح معصومیت اور بے تکلفی سے ہم سے باتیں کر رہے تھے۔

انہوں نے ہمیں بہت سے سربراہان مملکت کی طرف سے ملے ہوئے تحائف بھی دکھائے۔ ان میں سے کچھ چیزوں کے ساتھ ان کی بہت سی یادیں بھی وابستہ تھیں۔ ہم پہلے تو کچھ دیر تک مؤدب بچوں کی طرح خاموشی اور احترام سے ان کی باتیں زیادہ تر سنتے ہی رہے۔ پھر دھیرے دھیرے ہمارے انداز میں بھی تھوڑی سی بے تکلفی آ گئی۔

راج کپور نے ان سے کہا۔ "ہم نے سنا ہے، جوانی میں آپ بھی خواتین میں بہت مقبول تھے۔ کئی خواتین آپ پر مرتی تھیں؟"

"اتنی نہیں جتنی تم تینوں پر مرتی ہیں۔ میں تم لوگوں جتنا مقبول نہیں تھا۔" انہوں نے فوراً اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے کہا "سنا ہے کہ آپ کی اس دلکش مسکراہٹ نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا دل چرا لیا تھا؟"

ان کی مسکراہٹ میں کچھ شرمیلا پن اور رخساروں پر سرخی آ گئی۔

"مجھے خود بھی اپنے بارے میں اس قسم کے قصے سننا اچھا لگتا تھا۔" انہوں نے اعتراف کیا۔

وہ ہم تینوں سے مل کر، اور بے تکلفی سے گپ شپ کر کے بہت خوش نظر آ رہے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی خوشی میں ایک ہلکی سی افسردگی بھی پنہاں تھی۔ مجھے جلد ہی اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ میرا خیال ہے، انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں زیادہ دن کے مہمان نہیں ہیں۔ شاید وہ موت کی آہٹ سنا رہے تھے۔

میرا خیال درست ہی تھا۔ میں اس وقت ایک بار پھر امریکا کے دورے پر تھا جب مجھے خبر ملی کہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے پیچھے، نشیب و فراز سے بھرپور ایک تاریخ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

تمکین تبسم

دیو آنند کی داستانِ حیات

لائٹس آن تھیں مگر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا

قسط : 23

امریکا میں ہر بڑے اخبار کے صفحۂ اوّل پر، اور ہر قابلِ ذکر رسالے کے سرورق پر پنڈت نہرو کی تصویر چھپی۔ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ ساتھ تفصیلی مضامین میں، اپنے ملک اور جمہوریت کے لیے پنڈت جی کی خدمات کو سراہا گیا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ میرا خیال ہے، اس وقت تک امریکہ میں کسی ایشیائی بلکہ شاید دنیا کے کسی بھی سربراہِ مملکت کے انتقال پر اس کی اتنی تصویریں اور اس کے بارے میں اتنے مضامین اور خبریں نہیں چھپی تھیں جتنی پنڈت نہرو کے بارے میں چھپیں۔

میں نے مسز اندرا گاندھی کو تعزیتی ٹیلی گرام بھیجا۔ انہوں نے جب ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو ملک کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں انہیں پیٹھ پیچھے ''گونگی گڑیا'' کہا جاتا تھا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ''خاتونِ آہن'' کا خطاب حاصل کیا۔

انڈیا واپس آ کر میں ''گائیڈ'' کے اردو ورژن کے آخری مراحل کا کام نمٹانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ''تین دیویاں'' کے لیے ہدایتکار کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ یہ فلم میرے دوست امرجیت بنا رہے تھے جو ہماری کمپنی کے لیے پبلسٹی منیجر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس فلم کی کہانی بھی میں نے لکھی تھی لیکن بطور کہانی نویس اور ہدایتکار کسی اور کا نام دیا گیا تھا۔

میں ان کاموں میں مصروف تھا کہ اطلاع ملی، میرے والد کا اچانک گورداسپور میں اپنی زمینوں پر انتقال ہو گیا ہے۔ میں اس وقت فلم کے سیٹ پر تھا۔ چند لمحوں کے لیے میرے حواس شل ہو گئے۔ جب میں کچھ سوچنے، سمجھنے اور بولنے کے قابل ہوا تو میں نے شوٹنگ کینسل کر دی۔ کافی عرصہ پہلے میرے اور والد کے درمیان جو ایک قسم کی رنجش سی پیدا ہوئی تھی، وہ جلد ہی دور ہو گئی تھی۔ پھر مجھ سے چھوٹی دونوں بہنوں کی بمبئی میں ہی دھوم دھام سے شادی ہوئی تو والد صاحب بھی آئے تھے۔

وکیل ہونے کے باوجود وہ ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کے سر پہ ہمیشہ کی طرح ڈھیلی ڈھالی پگڑی تھی اور وہ اِدھر اُدھر مہمانوں کے درمیان گھومتے پھرتے، شادی کے شاندار انتظامات اور اپنے بیٹے کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ انہوں نے کبھی فلم نہیں دیکھی تھی اور وہ کسی فلم اسٹار کو نہیں پہچانتے تھے۔ مجھے ہر ایک سے ان کا تعارف کرانا پڑا اور اس کے بارے میں تھوڑا بہت بتانا پڑا۔ اس تقریب میں چند گروپ فوٹو بنوانے کے لیے دلیپ کمار بلا تکلف زمین پر بھی بیٹھ گئے تھے۔ انڈین فلم انڈسٹری کے اتنے بڑے اسٹار کی یہ انکسار پسندی صرف میرے لیے ہی نہیں، ہر ایک کے لیے متاثر کن تھی۔

میں نے اپنے والد کو بمبئی آ کر اپنے ساتھ رہنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن انہوں نے یہی جواب دیا تھا کہ انہیں گورداسپور میں اپنے مکان کے کھلے صحن میں، چارپائی پر سونا زیادہ پسند تھا جہاں انہیں تاروں بھرا آسمان دکھائی دیتا تھا۔ ان کی یادوں نے میرے ذہن پر یلغار کی تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں جب فلمی دنیا میں کامیابی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا..... اور جب کامیاب ہو چکا تھا، تب مجھے اپنے والد کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو یکایک ہی میری زندگی میں گویا ایک بھیانک خلا پیدا ہو گیا۔ مجھے بڑی شدت سے ان کی کمی محسوس ہونے لگی۔

میں گورداسپور گیا اور والد صاحب کی آخری رسوم میں شرکت کر کے واپس آ گیا۔ زندگی کا چلن کچھ ایسا ہی ہے۔ بڑے سے بڑے حادثے اور سانحے سے گزرنے کے بعد انسان ایک بار پھر اپنے معمولات کی طرف لوٹ آتا ہے۔ لوگ چلے جاتے ہیں، اپنے پیچھے یادیں چھوڑ جاتے ہیں اور ہم ان یادوں کو سینے سے لگائے ایک بار پھر اپنی ذمہ داریوں اور مصروفیات میں الجھ جاتے ہیں۔

عامر خان کو فلم ''اول نمبر'' (1990ء) کیلئے ڈائریکشن دیتے ہوئے

سونو نگم کے ساتھ

چند دن بعد میں اسی فلم کے سیٹ پر تھا، جس پر مجھے اپنے والد کے انتقال کی خبر ملی تھی، اسی دوران ایک شخص اندر آیا اور میرے قریب آ کر اس نے سرگوشی میں مجھے اطلاع دی۔ ''گرودت اس دنیا میں نہیں رہے۔''

لائٹس آن تھیں۔ سیٹ پر دن کا سا سماں تھا۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اداکار شاٹ دینے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ جب میں ذرا سنبھلنے میں کامیاب ہوا تو میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''شوٹنگ پیک اپ..... گرودت کا انتقال ہو گیا ہے۔''

گزشتہ شام ہی کی بات تھی کہ اس نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ میں کافی دنوں بعد اس کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا۔ وہ مجھے کافی کمزور اور بیمار سا دکھائی دیا۔ اس کے بال بھی چھدرے ہو چکے تھے۔ کمزور سی آواز میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا تھا۔ ''دیو.....! ہمیں ایک اور فلم اکٹھے کرنی چاہیے۔''

''ضرور..... ضرور.....'' میں نے گرمجوشی اور خلوص سے کہا تھا۔ ''کوئی اچھا سا اسکرپٹ تلاش کرو۔ تمہیں معلوم ہے، تمہارے ساتھ کام کرنے کے لیے میں ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔''

کل میری اس سے یہ بات ہوئی تھی اور آج مجھے اس کی موت کی اطلاع مل رہی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور سیدھا گرودت کے گھر چلا گیا۔ میں شاید گھر سے باہر کا پہلا آدمی تھا جو گرودت کی موت کی خبر سن کر وہاں پہنچا تھا۔ مجھے اپارٹمنٹ کے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں بیڈ پر اس کا بے جان جسم پڑا تھا۔

اس کا چہرہ نیلا ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ نیلا محلول تھا جو ایک گلاس میں اب بھی اس کے قریب تپائی پر رکھا تھا۔ یہ کوئی زہر تھا جسے پی کر گرودت نے خودکشی کی تھی۔ خودکشی کی وجہ یقیناً اس کی نجی زندگی کی وہ پریشانیاں ہوں گی جن سے میں بھی لاعلم تھا۔

☆.....☆.....☆

میری فلم ''گائیڈ'' جسے میں نے بڑے ذوق وشوق اور اہتمام سے بنایا تھا، مکمل ہوئی تو اس کا ریلیز ہونا ایک پہاڑ سر کرنے کے مترادف محسوس ہونے لگا۔ ایک خاص لابی اس کی تکمیل سے بہت پہلے ہی اس کے خلاف سرگرم ہو چکی تھی۔ اوپر سے امریکا میں اس کا انگلش ورژن فلاپ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس لابی کو اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا موقع مل گیا۔ انڈیا میں بھی اس کے فلاپ ہونے کی پیش گوئیاں تو جاری ہی تھیں لیکن اس کی ریلیز کے راستے میں بھی روڑے اٹکائے جانے لگے۔

ایسی فلمیں جو کسی دوسرے ملک کے اشتراک سے بنائی جاتی تھیں، ان کے لیے ویسے ہی سنسر بورڈ سے ایک خصوصی سرٹیفکیٹ، الگ سے لینا پڑتا تھا۔ اُدھر یہ عالم تھا کہ اس فلم کے، سنسر بورڈ میں جانے سے پہلے ہی وہاں ہزاروں کی تعداد میں خطوط پہنچنے لگے کہ اسے سنسر سرٹیفکیٹ نہ دیا جائے کیونکہ اس کا مرکزی خیال بھارتی ثقافت کے خلاف ہے۔ اس کے انگریزی ورژن کو تو انڈیا میں ریلیز کرنے کی خاص طور پر مخالفت کی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمیں فلم کی ریلیز کے لیے کوئی ڈسٹری بیوٹر تک دستیاب نہیں تھا۔

آخر کار مجھے خود مسز اندرا گاندھی سے بات کرنی پڑی جو ان دنوں نئی مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات بنی تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ خود فلم دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ ان کی فرمائش پر دارالحکومت نئی دہلی میں ان کے لیے فلم دیکھنے کا انتظام کیا گیا۔ وہ اپنے اسٹاف اور چند قریبی دوستوں کے ساتھ سنیما میں فلم دیکھنے آئیں۔ وہ پچھلی صف میں تھیں، جبکہ میں ذرا آگے بیٹھا ہوا تھا، تاہم فلم چلنے کے دوران میرے کان پیچھے ہی کی طرف لگے ہوئے تھے کہ دیکھوں، خود مسز اندرا گاندھی یا ان کے ساتھی فلم پر کیا تبصرے کرتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ پوری فلم کے دوران وہ سب لوگ خاموش رہے اور مجھے کوئی تبصرہ سننے کو نہیں ملا۔ آخر کار فلم ختم ہوئی تو میں اٹھ کر پیچھے پہنچا اور مسز اندرا گاندھی سے فلم کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہی۔ انہوں نے فلم کی کوئی خاص خرابی یا نقص بتانے کے بجائے صرف اتنا کہا۔ ''آپ ڈائیلاگ بہت تیز تیز بولتے ہیں۔''

''جی ہاں..... یہ خامی مجھ میں ہے.....'' میں نے تسلیم کیا اور کہا۔ ''میں اس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ کو کلیئرنس سرٹیفکیٹ جلد مل جائے گا۔'' انہوں نے کہا اور رخصت ہو گئیں۔ میرے سینے سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا۔

نامعلوم لوگوں کی طرف سے فلم کے بارے میں منفی کوششیں ایک طرف..... لیکن جیسے تیسے فلم ریلیز ہوئی تو ہر شہر میں اسے دیکھنے کے لیے عوام کے ہجوم امنڈ آئے۔ دہلی میں اس کے پریمیئر شو میں وزیراعظم کو چھوڑ کر، باقی پوری کابینہ یہ فلم دیکھنے کے لیے آئی۔ نشستوں کی کمی کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے کھڑے ہو کر فلم دیکھی۔ فلم کے خلاف جتنی سازشیں ہو رہی تھیں، اتنا ہی اس کے بارے میں تجسس کا ماحول بن چکا تھا۔ ناول کی بنیاد پر اس کا فلمی اسکرپٹ گولڈی نے لکھا تھا اور بلا شبہ اس کام کے علاوہ ڈائریکشن میں بھی اس کی صلاحیتیں عروج پر نظر آئیں۔

سان فرانسسکو میں ''لوایٹ ٹائمز اسکوائر'' کی شوٹنگ کرتے ہوئے (2003ء)

جہاں تک اداکاری کا تعلق تھا تو میں بھی اپنی بساط سے بڑھ کر کام کر گزرا۔

ہم نے بمبئی میں بھی ایک پریمیئر شو کا اہتمام کیا، جس میں فلم انڈسٹری کے ہر قابلِ ذکر فرد کو مدعو کیا۔ فلم دیکھنے کے بعد وہ سب سحر زدہ سی حالت میں رخصت ہو گئے۔ میں اور گولڈی سنیما ہاؤس کے مین گیٹ پر کھڑے تھے لیکن جاتے وقت کسی نے ہمارے کندھے پر تھپکی تک نہیں دی اور نہ ہی کوئی اچھا یا برا تبصرہ کیا۔ فلم دیکھنے کے دوران بھی وہ اسی طرح مبہوت سے رہے تھے۔ ہمیں بعض ذرائع سے پتا چلا کہ انہوں نے گھر جا کر بھی اس کے بارے میں کچھ اسی قسم کے تبصرے کیے تھے کہ ان دونوں بھائیوں نے یہ فلم بنا کر اپنی خودکشی کا سامان کر لیا ہے۔

اس قسم کے تبصرے اور آراء ایک طرف..... لیکن اس فلم کو بہرحال انڈین سنیما کی تاریخ میں کلاسک کا درجہ حاصل ہوا اور تقریباً ہر شعبے میں فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ حیرت کی بات البتہ یہ رہی کہ اس کی موسیقی، جو ایس ڈی برمن کی زندگی کی بہترین موسیقی شمار ہوئی ہے، اس پر اسے فلم فیئر ایوارڈ نہیں ملا۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ آج تک سب کے لیے ایک معما ہے۔ برسوں بعد جب یہ فلم ''دوردرشن'' (ٹی وی چینل) سے نشر ہوئی تو اس دوران گلیاں سُونی نظر آئیں۔ مجھے خوشی صرف اس بات کی تھی کہ میں نے روٹین سے ہٹ کر ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا اور میرا تجربہ کامیاب رہا تھا۔

آسکر ایوارڈ کی، غیر ملکی زبان کی فلموں والی کیٹگری میں ''گائیڈ'' سرکاری طور پر بھیجی گئی۔ میں اور گولڈی بھی فلم کے ساتھ امریکا گئے۔ وہاں دکھانے کے لیے ہم نے اسے مختصر کر دیا تھا اور گانے نکال دیے تھے۔ گو کہ ایوارڈ تو اسے نہیں مل سکا، لیکن بہت سراہا گیا۔ بہت سے لوگوں نے ہمیں وہاں مشترکہ فلمسازی کی دعوت دی لیکن ہم نے ان سے معذرت کرنا ہی بہتر سمجھا۔

گولڈی نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اگلی فلم جرم وسزا کے موضوع پر بنانی چاہیے جس میں تجسس اور سنسنی ہو۔ اس نے ایک اور رائٹر، کے۔ اے نارائن کو ساتھ ملا کر ''جیول تھیف'' (Jewell Thief) کی کہانی تیار کی۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس کہانی کو کسی ایسے علاقے کے پس منظر میں فلمایا جائے، جو اس سے پہلے کسی انڈین فلم میں نہ دکھایا گیا ہو۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

وہ حسین اجنبی لڑکی مارلن برانڈو کی سیکرٹری تھی

قسط : 24

شوٹنگ کے لیے میں نے سکم کا نام تجویز کیا۔ یہ انڈیا کے شمال مشرق میں واقع ایک چھوٹی سی بادشاہت تھی۔ جس کی سرحدیں چین، نیپال اور بھوٹان سے ملتی تھیں۔ دارجلنگ سے یہ مقام زیادہ دور نہیں تھا۔ علاقہ نہایت ہی خوبصورت تھا۔ ہم جب سرحد پر پہنچے تو سرحدی محافظوں نے مجھے پہچان لیا اور پوچھ گچھ کرنے کی بجائے ہماری رہنمائی کی۔ ہمیں شاہی محل میں بھی لے جایا گیا جہاں ہماری نوجوان بادشاہ چوگیال اور اس کی امریکی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی جوڑی نہایت خوبصورت اور متاثر کن تھی۔ میں نے ان کی شخصیت اور ان کے ملک کی خوبصورتی کی خلوصِ دل سے تعریف کی، وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے ملک میں شوٹنگ کرنے کے لیے ہمیں خوش آمدید کہا۔

''جیوئل تھیف'' جب سکم کے انتہائی خوبصورت پس منظر میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تو سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ میں اوڈین سنیما میں اس کا پریمیئر شو دیکھنے کے لئے دارجلنگ سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچا۔ میں جب سنیما ہاؤس کے سامنے گاڑی سے اترا تو وہاں موجود بہت بڑے ہجوم میں شامل لوگ مجھے دیکھ کر خوشی سے اُچھلنے کودنے اور نعرے لگانے لگے۔ پھر انہوں نے مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔ ان میں سے کچھ نے مجھے ہار پہنائے، کچھ نے ہاتھ ملائے اور کچھ نے میرے جسم پر چٹکیاں بھی بھریں۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں سچ مچ ان کے سامنے ہوں اور وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہے۔

پھر مجھے کچھ یوں لگا جیسے کسی نے میری پینٹ کی پچھلی جیب پر ہاتھ پھیرا ہے۔ میں نے جب اس جیب کو ٹٹولا تو مجھے پتا چلا کہ میرا بٹوا غائب ہو چکا ہے۔ بٹوے میں چند ہزار روپے تھے لیکن اس وقت مجھے ان کے غائب ہونے کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ اپنے پرستاروں کا والہانہ پن اور اپنی فلم کی کامیابی کے آثار دیکھ کر میں جتنا خوش تھا، اس کے سامنے چند ہزار روپے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے اس شخص کو، خوشی سے ناچتے ہوئے، دور جاتے بھی دیکھا جس کے بارے میں مجھے کافی حد تک یقین تھا کہ بٹوا اس نے نکالا ہے..... لیکن میں نے اسے جانے دیا۔ اتنے بہت سے پرستاروں میں وہ ایک ایسا آدمی تھا جو اپنی پسندیدگی اور عقیدت کی قیمت وصول کر کے جا رہا تھا۔

اب میں اپنی ایک اور فلم کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ باقاعدہ ڈائریکٹر کے طور پر یہ میری پہلی فلم تھی جس پر اس حیثیت سے میں نے اپنا نام بھی دیا تھا۔ اس فلم کا نام تھا ''پریم پجاری''۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے اس فلم کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں جنگ سے متاثرہ علاقوں میں بھی گیا تھا اور جنگ کے ہولناک نتائج یا اثرات کا مشاہدہ میں نے اپنی آنکھوں سے کیا تھا جس کے بعد میرے ذہن میں خیال آیا کہ لوگوں کو جنگ سے نفرت، امن سے محبت اور بھائی چارے کے فروغ کا درس دیا جائے۔

''پریم پجاری'' کے لئے لوکیشنز تلاش کرنے اور پھر شوٹنگ کی غرض سے مجھے انڈیا کے علاوہ دیگر ممالک کا بھی سفر کرنا پڑا۔ انگریزی دور کے ایک لیفٹیننٹ کرنل منٹگمری عرف 'مونٹی' سے میری اچھی دوستی تھی۔ تقسیم ہند اور اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد منٹگمری اپنے وطن واپس چلا گیا تھا اور لندن میں رہائش پذیر تھا۔ میری فلم ''ہم دونوں'' کے جنگی مناظر اس کی نگرانی میں فلمائے گئے تھے اور اس تجربے کے دوران اسے بھی فلم پروڈکشن اور ڈائریکشن سے تھوڑی بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے ''پریم پجاری'' کے سلسلے میں بھی اس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا اور میں لندن سے سڑک کے راستے یورپ کے بہت سے علاقوں میں جانا چاہتا تھا۔ لندن کے تو چپے چپے سے مونٹی بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اس قسم کے آدمی کے ساتھ سفر کرنے میں جو بات تھی، وہ کرائے کی گاڑی اور پیشہ ور ڈرائیور میں نہیں ہو سکتی تھی۔

گاڑی تو ہم نے لندن سے کرائے پر ہی لی، لیکن اسے مونٹی چلا رہا تھا۔ ڈوور پہنچ کر ہم نے کار کو بھی اپنے ساتھ موٹر بوٹ میں لادا اور فرانس پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے 'لاٹوکی' پہنچے۔ ہم نے جس ہوٹل میں قیام کیا، اس کے منیجر نے ہمیں بتایا کہ مارلن برانڈو بھی اس مقام پر شوٹنگ کے لئے آ رہے تھے۔

ہم آدھی رات کے بعد اس ہوٹل میں پہنچے تھے اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں کمرے مل گئے تھے۔ ہوٹل میں وہی دو کمرے خالی تھے جو ہمیں دے دیئے گئے تھے۔ کمرے بک کرانے کے بعد ابھی ہم ریسپشن پر ہی کھڑے تھے کہ ایک نہایت خوبصورت، سفید فام لڑکی بیگ اٹھائے آن پہنچی۔ اسے بھی ہوٹل میں قیام کے لئے کمرا درکار تھا لیکن ہوٹل میں اب کوئی کمرا دستیاب نہیں تھا۔ اس کے سامنے صرف یہی راستہ تھا کہ وہ ہم دونوں میں سے کسی کے ساتھ کمرے میں قیام کر لے۔ یورپ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایسا ہوتا رہتا تھا۔

کاؤنٹر پر موجود شخص نے لڑکی کو انتخاب کا حق دے دیا کہ وہ چاہے تو میرے ساتھ کمرا شیئر کر لے اور چاہے تو مونٹی کے کمرے میں چلی جائے۔ لڑکی نے باقاعدہ ہم دونوں کا سرتاپا جائزہ لیا، پھر میری طرف اشارہ کر دیا۔ اس احساس سے میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ ایک خوبصورت، خوش لباس اور اسمارٹ لڑکی میرے لئے قطعی اجنبی ہونے کے باوجود میرے ساتھ کمرے میں قیام کرنے جا رہی تھی۔

''لِنڈا.....'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف بھی کرا دیا۔

میں نے بھی اپنا نام بتایا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ ہم فلم کی شوٹنگ کے لئے لوکیشنز کی تلاش میں سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ ریسپشنسٹ نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے، مسکراتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''یہ بھی کچھ اسی قسم کے کاموں کے سلسلے میں یہاں آئی ہیں۔ آپ چاہیں تو رات میں ان سے گپ شپ کرتے ہوئے، مارلن برانڈو کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ان کی سیکرٹری ہیں۔''

کمرے میں بیڈ اتنا بڑا تھا کہ ہم دونوں کے لیٹنے کے بعد بھی بیچ میں کافی جگہ خالی رہی۔ لِنڈا جب منہ دوسری طرف کر کے لیٹی تھی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ اپنے ملک کے کتنے بڑے اسٹار ہیں؟''

''مارلن برانڈو تمہارے ملک کے کتنے بڑے اسٹار ہیں؟'' میں نے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔

''وہ تو بہت بڑے اسٹار ہیں۔'' لِنڈا نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں شاید اتنا بڑا نہیں..... لیکن بہرحال..... میں بھی اپنے ملک کا ایک بڑا اسٹار ہوں.....''

تب لِنڈا نے اس امر پر بھی غور شروع کر دیا کہ کیا مجھے اور مارلن برانڈو کو کسی فلم میں یکجا کیا جا سکتا ہے؟

دوسرے روز میں اور مونٹی، لِنڈا کو خدا حافظ کہہ کر سوئٹزرلینڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہر طرف خوبصورت فطری مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ ہمیں 'گلیش' نامی ایک نہایت خوبصورت گاؤں شوٹنگ کے لئے بہت پسند آیا۔ وہاں ہم نے ایک سرائے نما ہوٹل میں قیام کیا۔ 'جل' نامی ایک معصوم صورت اور اسمارٹ لڑکی وہاں ویٹرس کے طور پر کام کرتی تھی اور کچن میں جا کر لکڑی اور کوئلوں کے چولہوں پر کھانے بھی بناتی تھی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی اور چھٹیوں میں وہاں آئی ہوئی تھی تاکہ ان خوبصورت علاقوں کی سیاحت کے ساتھ ساتھ اپنے تعلیمی اخراجات کے لئے کچھ رقم بھی کما سکے۔

وہ فارغ وقت میں پڑھتی بھی تھی اور اپنے پُرمشقت روز و شب کے باوجود ہمیشہ خوش نظر آتی تھی۔ ایک دلفریب اور من موہنی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ اس کا نام سن کر سب سے پہلے مجھے بچوں کی ایک مشہور انگریزی فلم ''جیک اینڈ جل.....'' یاد آ گئی تھی۔ وہ آئرش تھی لیکن فرنچ وغیرہ بھی جانتی تھی۔ میں نے اپنی، لوکیشنز تلاش کرنے کی مہم کے دوران اسے اپنی مترجم بننے کی پیشکش کر دی۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس نے میری یہ پیشکش قبول کر لی اور بہت اچھی مددگار و معاون ثابت ہوئی۔

سوئٹزرلینڈ کے بعد ہماری منزل اسپین کا شہر میڈرڈ اور لبنان کا شہر بیروت بھی تھا، جو اس زمانے میں مشرق وسطیٰ کا پیرس کہلاتا تھا۔ مجھے وہاں شوٹنگ تو نہیں کرنی تھی۔ میں صرف نادیہ جمال سے بات کرنے وہاں گیا تھا۔ وہ اس دور کی مشہور ترین بیلی ڈانسر تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ میری فلم میں ایک ڈانس کرے۔ میں اسے اس کے لئے آمادہ کرنے میں کامیاب رہا۔ یوں بڑی کاوشوں اور محنت کے بعد فلم ''پریم پجاری'' وجود میں آئی۔ اس کی کہانی بھی میں نے خود ہی لکھی تھی۔

اس کی کچھ شوٹنگ پنجاب کی 'کولو وادی' میں بھی ہوئی تھی جس سے دریائے بیاس گزرتا ہے۔ اس کے اونچے نیچے پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے آپ درۂ روہتانگ عبور کریں تو ہر طرف ایسے خوبصورت فطری نظارے دکھائی دیتے ہیں کہ انسان گویا سانس لینا بھول جاتا ہے۔ میں راج کھوسلہ کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم ''بمبئی کا بابو'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں پہلے بھی وہاں جا چکا تھا جس کے دوران سردار پرتاپ سنگھ کائرون مجھ سے ملنے آئے تھے۔

سردار پرتاپ سنگھ، تقسیم ہند سے پہلے، غیر منقسم پنجاب کے نہایت طاقتور وزیراعلیٰ تھے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں جب پنجاب بھی تقسیم ہو چکا تھا تو سردار پرتاپ سنگھ وزیراعلیٰ نہیں تھے۔ ان دنوں اس پنجاب کو مزید تقسیم کر کے، ایک کی جگہ تین صوبے بنانے کی باتیں ہو رہی تھیں جن دنوں سردار پرتاپ سنگھ سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اس سلسلے میں بے حد جذباتی تھے اور ان کا کہنا تھا کہ وہ کسی قیمت پر پنجاب کو مزید تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ ایسا کرنے والوں کو ان کی لاش پر سے گزرنا ہوگا۔

ان کی بات سچ ثابت ہوئی۔ جب ہم ''پریم پجاری'' کی شوٹنگ کرنے کے لئے کولو وادی میں گئے، اس وقت تک پنجاب میں مزید دو صوبے ہریانہ اور ہماچل پردیش بن چکے تھے جبکہ سردار پرتاپ سنگھ کو قتل کیا جا چکا تھا۔ گولیوں سے چھلنی ان کی لاش ایک روز ان کی گاڑی میں صوبہ پنجاب کے ایک ہائی وے پر پائی گئی تھی۔

میں نے فلم ''پریم پجاری'' بڑی محنت سے بنائی تھی اور اس میں لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ جنگ ایک بے معنی اور لاحاصل چیز ہے، اس سے بنی نوع انسان کو ناقابل تلافی نقصانات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو امن و آشتی کی باتوں کو بزدلی سمجھتا ہے۔ گو کہ یہ طبقہ محدود ہے لیکن اپنے متشددانہ طریقوں سے اپنی سوچ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فلم کے ریلیز ہوتے ہی یہ طبقہ اس فلم کے خلاف میدان میں آ گیا۔ اوپر سے سنسر بورڈ نے بھی اس فلم کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ شترو گھن سنہا کو میں نے اس فلم میں متعارف کرایا تھا اور انہوں نے ایک پاکستانی کرنل کا رول نہایت متاثر کن انداز میں ادا کیا تھا۔ حکومت کی نمائندگی کرنے والے سنسر بورڈ نے ان کے بیشتر مکالمے کاٹ دیے۔ جن علاقوں میں تشدد پسندوں اور جنگ کو ہی ہر مسئلے کا حل سمجھنے والوں کی اکثریت تھی، وہاں انہوں نے فلم کی نمائش کے دوران خوب ہنگامے کیے اور سنیما ہال کا فرنیچر توڑ دیا۔

انہوں نے نہ صرف خود فلم کا بائیکاٹ کیا بلکہ لوگوں کو بھی اس کے لئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ ایک فلم اسٹار کے طور پر مجھے اپنا کیریئر خطرے میں نظر آنے لگا۔ کلکتہ میں ایک مخصوص سیاسی جماعت کے لوگ سنیما گھروں کے پروجیکشن روم میں گھس گئے۔ انہوں نے بندوقوں اور پستولوں کے زور پر نہ صرف چلتی ہوئی فلم رکوا دی بلکہ فلم دیکھنے والوں کو بھی خوفزدہ کیا۔

میری فلم سیاست کے گندے کھیل کی لپیٹ میں آ گئی۔ مغربی بنگال میں ''یونائیٹڈ فرنٹ'' برسراقتدار تھا۔ اس میں شامل مارکسسٹ میری فلم کے فلسفے کے خلاف تھے۔ بنگال میں میری فلم کے ڈسٹری بیوٹر کو ریلیز سے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ وہاں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے ریلیز سے پہلے صوبے کے وزیر داخلہ، اس کی فیملی اور دیگر کچھ لوگوں کے لیے کلکتہ کے ایک سنیما ہاؤس میں فلم کی خصوصی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ میں خود بھی اس شو میں موجود تھا۔ وزیر داخلہ جیوتی باسو اور اس کی فیملی اچھی طرح مجھ سے ملی لیکن فلم ختم ہونے کے بعد جب میں ان کا شکریہ ادا کرنے پہنچا تو وہ لوگ فلم کے بارے میں اچھا یا برا، ایک لفظ کہے بغیر رخصت ہو گئے۔ فلم ریلیز ہونے کے بعد گو کہ اس کے ہاؤس فل جا رہے تھے لیکن انتہا پسندوں اور تشدد پرستوں کی کارروائیوں کے بعد ہمیں پورے مغربی بنگال میں فلم کی نمائش روکنی پڑی۔

(جاری ہے)

allurdudnovels.blogspot.com

ہم نے جو کچھ دیکھا وہ کسی فلم سے بڑھ کر تھا

تمکین تبسم

قسط : 25

میں اس وقت نیپال کے دارالحکومت کٹھمنڈو میں تھا، جب مجھے اطلاع ملی کہ مغربی بنگال میں سیاسی کارکنوں نے زبردستی ہماری فلم ''ہم دونوں'' کو سینما گھروں سے اتروا دیا ہے۔ میں نیپال کے شہزادے بریندرا کی شادی میں شرکت کے لیے شاہی مہمان کی حیثیت سے وہاں گیا تھا۔ نیپال کے بادشاہ مہیندرا نے مجھے شادی کی تقریبات میں مدعو کیا تھا جو ایک ہفتہ جاری رہنا تھیں، لیکن اسی دوران مجھے اطلاع ملی کہ مغربی بنگال میں ہماری فلم کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

ظاہر ہے، میں بے حد پریشان ہوا۔ شادی کی تقریبات ختم ہوتے ہی میں پہلی پرواز سے نئی دہلی پہنچا اور وزیر داخلہ 'وائی۔ بی چاون' سے ملاقات کی۔ وہ میرے ذاتی شناسا تھے لیکن ان سے بات چیت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وزیر خارجہ ہونے کے باوجود وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے وہی روایتی تسلی دی جو اس قسم کے معاملات میں سیاستدان وزیر دیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ''میں اس معاملے کو دیکھوں گا۔''

میں نے اس معاملے پر صبر کیا اور اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں نے اس فلم پر جتنی محنت کی تھی اور اس میں جو پیغام دیا تھا، اس کے ضائع ہونے کا مجھے افسوس تھا لیکن میری عادت ہے کہ میں کسی صدمے کو زیادہ دیر تک دل سے نہیں لگائے رکھتا اور جلد از جلد اسے بھولنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ کو نئے کاموں میں مصروف کر لیتا ہوں۔ اس وقت بھی میں نے اپنے لیے نئی مصروفیت تلاش کر لی، یعنی اپنی اگلی فلم کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

اس فلم کا آئیڈیا مجھے کٹھمنڈو میں آیا تھا جب میں پرنس بریندرا کی شادی کے سلسلے میں وہاں مقیم تھا۔ میں اس کا تھوڑا سا پس منظر آپ کو بتاتا چلوں۔ امید ہے، آپ بھی اس میں دلچسپی محسوس کریں گے۔ میں جب کٹھمنڈو میں تھا تو مجھے پیغام ملا کہ 'کرسچین ڈورمز' نامی ایک شخص کا میرے لیے فون آیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ دستاویزی فلمیں بنانے والا ایک جرمن پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھا، جس سے میری ملاقات 1962ء میں برلن فلم فیسٹیول میں ہوئی تھی۔ وہ کٹھمنڈو آیا ہوا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ میں بھی کٹھمنڈو میں ہوں، تو اس نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم ایک بار پھر مل بیٹھیں۔

ہم دونوں فطری طور پر مہم جو قسم کے آدمی تھے۔ ہمیں جب بھی موقع ملتا تھا، ہم نئی نئی باتیں جاننے اور نئی نئی جگہیں دریافت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس شام بھی ہماری ملاقات ہوئی تو ہم ایک کیفے دیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس کا نام 'دی بیکری' تھا اور ہم نے سنا تھا کہ وہ ہپیوں کا گڑھ ہے۔ اس زمانے میں یہ خاص قسم کے لوگ اکثر ملکوں میں نظر آتے تھے اور ان میں زیادہ تر سفید فام ہوتے تھے۔

اپنے دیرینہ دوست دلیپ کمار کے ساتھ

دیو آنند اور ان کی اہلیہ کلپنا کارتک، نیپال کے بادشاہ مہیندرا اور ملکہ کے ساتھ

اپنے حلیے کی وجہ سے یہ لوگ دور سے ہی پہچانے جاتے تھے۔ ان کے بال لمبے، کپڑے عجیب و غریب، میلے اور 'بے تکے' گلے میں عموماً مالائیں ہوتیں۔ ان میں زیادہ تر جوڑوں کی شکل میں ہوتے۔ کئی کئی افراد عام طور پر اکٹھے سفر کرتے۔ یہ کم سے کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ ملکوں کی سیاحت کرنے کی کوشش کرتے۔ زیادہ تر حالتِ سفر میں ہی رہتے۔ لفٹ لے کر سفر کرتے یا سستے ترین ذرائع آمد و رفت استعمال کرتے۔ یہ لوگ اکثر گندے حلیے میں ہی دکھائی دیتے۔ افیم، چرس، بھنگ اور ایل ایس ڈی ان کی پسندیدہ منشیات تھیں اور یہ چیزیں استعمال کرنا ان کا روز کا معمول تھا۔

ان کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ دنیا کے ہر غم سے بیگانے ہو کر اپنے آپ میں مگن اور مست و بے خود رہو۔ یہ سست، کاہل، نکمے اور زندگی سے نامطمئن لوگوں کی ایک نسل تھی جو کوئی کام کاج کرنا نہیں چاہتی تھی اور اپنے حالات یا ذہنی ناآسودگی سے فرار حاصل کرنے کے لیے نشوں کی آغوش میں پناہ تلاش کرتی تھی اور زندگی سے تمام لذتیں کشید کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ بہت سے لوگ محض مہم پسندی کی وجہ سے، یا پھر اسے بھی ایک طرح کا فیشن سمجھ کر ہپیوں کی ''برادری'' میں شامل ہو جاتے تھے۔

کٹھمنڈو اس زمانے میں ہپیوں کا سب سے بڑا گڑھ بن گیا تھا کیونکہ یہاں ان کی پسندیدہ منشیات کی فراوانی تھی اور ان کے مشاغل یا حرکتوں پر کسی قسم کی روک ٹوک بھی نہیں تھی۔ کٹھمنڈو میں 'دی بیکری' نامی کیفے ان کا سب سے مشہور اور پسندیدہ ٹھکانا تھا، جہاں شام ہوتے ہی ان کی ٹولیاں جمع ہونے لگتی تھیں اور پھر دن چڑھنے تک اسی کے اندر، یا آس پاس پائی جاتی تھیں۔ ہپیوں کے حوالے سے یہ جگہ اتنی مشہور تھی کہ اس کا ذکر 'ٹائم' میگزین میں بھی آ چکا تھا۔

ایک پہاڑی سے اتر کر، تنگ سی گلیوں سے گزرتے ہوئے میں اور کرسچین ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے ہم 'دی بیکری' اور اس کے گرد و نواح کا آسانی سے نظارہ کر سکتے تھے۔ کرسچین کا مشورہ تھا کہ ہمیں ان کے زیادہ قریب نہیں جانا چاہیے کیونکہ ہم کسی طرح بھی ان کے ''قبیلے'' کے دکھائی نہیں دیتے تھے اور وہ اس وقت اپنے شغل میلے میں مصروف تھے۔ کرسچین کو اندازہ تھا کہ اس وقت منشیات کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن آسمان اور زمین کے درمیان کہیں پرواز کر رہے ہوں گے۔ اپنی اس کیفیت کے دوران یہ ایسے لوگوں کو برداشت نہیں کرتے تھے، جو ان کے درمیان الگ تھلگ اور اجنبی دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ ہمارے لیے دور سے ہی ان کا مشاہدہ کرنا بہتر تھا۔

ہم نے جو کچھ دیکھا، وہ کسی فلم سے کم نہیں تھا۔ کیفے کے آس پاس کافی رقبہ سبزہ زار اور باغ جیسا تھا جہاں ہپیوں کی کئی ٹولیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں زیادہ تر لمبے، الجھے ہوئے بالوں اور داڑھیوں والے مرد تھے۔ ان میں سے بعض چت لیٹے ہوئے آسمان کو تک رہے تھے۔ ان کے درمیان چرس کی چلمیں گردش کر رہی تھیں اور فضا میں پھیلی ہوئی چرس کی بو ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ مردوں کی ساتھی عورتیں اور لڑکیاں ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھیں یا پھر ان کے سینے پر سر ٹکائے بیٹھی تھیں۔ ہر مرد یا عورت چلم سے کش لے کر اسے آگے بڑھا دیتی تھی۔

وہاں صرف چند موم بتیاں روشن تھیں جن کی لرزتی روشنی میں ان کی شکلیں عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ سب دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے اور جس کا، جو جی چاہ رہا تھا، وہ کر رہا تھا۔ فضا میں کبھی کسی کی مخمور ہنسی ابھرتی اور کبھی کسی کی سسکی۔ کئی مردوں نے گیندے اور سورج مکھی کے پھولوں کے بڑے بڑے ہار پہنے ہوئے تھے۔ کبھی کوئی مرد اٹھ کر، لباس سے بے نیاز ہو کر رقص شروع کر دیتا۔ کوئی اچانک گٹار بجانا شروع کر دیتا۔ کوئی اپنے ہونٹوں میں جھولتی سگریٹ کے ساتھ کوئی گانا اور تالیاں بجانا شروع کر دیتا۔ کوئی عورت اس کا ساتھ دینے کے لیے رقص کرنے لگتی۔

ان سب میں مجھے صرف ایک نوجوان لڑکی ایسی دکھائی دی جس کی رنگت گندمی تھی اور وہ بے حد پرکشش بھی تھی۔ اس کے نقوش مشرقی تھے۔ پھر میں نے صاف طور پر اس کی آواز بھی سنی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ ''بوب! میرا چشمہ.....''

وہ یقیناً انڈین تھی۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ کہاں سے ان لوگوں میں آ گئی تھی اور کس طرح انہی کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ اس کے پیچھے یقیناً کوئی کہانی تھی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک فلم کا خیال جنم لینے لگا۔ میں ایک ایسے موضوع پر فلم بنانے کے بارے میں سوچنے لگا جس پر انڈیا میں اس سے پہلے کوئی فلم نہیں بنائی گئی تھی۔ میں جس معیاری ہوٹل میں مقیم تھا، اس کے بارمین کو میں نے اس لڑکی کے بارے میں بتایا جو مجھے مشرقی لگی تھی اور جسے میں نے ہپیوں میں گھرے دیکھا تھا۔

وہ فوراً سمجھ گیا کہ میں کس لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ لڑکی واقعی نیپال کی نہیں تھی۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس ملک سے آئی تھی، تاہم اسے یہ پتا تھا کہ وہ اپنے کسی نیپالی بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ بارمین نے بتایا کہ وہ مجھے اس لڑکی سے ملوا بھی سکتا تھا۔ میں نے فوراً نہ صرف آمادگی ظاہر کر دی بلکہ اس کی خدمت میں معقول ٹپ بھی پیش کی۔

دوسرے روز میں مقررہ وقت پر بار میں پہنچا تو واقعی وہ وہاں موجود تھی۔ اس مختلف ماحول میں، سنجیدہ انداز میں بیٹھی، وہ اس وقت سے بہت بہتر لگ رہی تھی جب میں نے اسے ہپیوں کے درمیان دیکھا تھا۔ وہ اداکار کے طور پر مجھے پہچانتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نہ صرف اس کے، بلکہ اس کی والدہ کے بھی پسندیدہ اداکاروں میں شامل تھا، اس کی والدہ کینیڈا کے شہر مانٹریال میں تھیں اور وہ چھٹیاں گزارنے کٹھمنڈو آئی ہوئی تھی۔

رفتہ رفتہ وہ کھلتی چلی گئی اور اس نے اپنی اصل کہانی بیان کر دی۔ وہ انہی نوجوانوں کی نمائندہ تھی جنہیں ''ناراض نسل'' کہا جا سکتا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں معاشرہ سے، نظام سے، حتیٰ کہ اپنے والدین سے بھی بہت سی شکایتیں تھیں۔ انہی جائز یا ناجائز شکایتوں کو جواز بنا کر یہ لوگ اپنی دانست میں معاشرے سے بغاوت کر دیتے تھے اور ہر بندھن سے آزاد ہو کر زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کم از کم ان کا اپنا خیال یہی تھا کہ وہ خوشیوں کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہ ہپیوں ہی کا نظریۂ حیات تھا جس سے متاثر ہو کر لوگ ان میں شامل ہوتے چلے جاتے تھے۔

وہ لڑکی بھی انہی میں سے ایک تھی۔ اس کا اصل نام جسبیر تھا لیکن اس نے اسے بدل کر جینائس (Janice) کر لیا تھا۔ وہ درحقیقت اپنی ماں سے ناراض ہو کر، گھر سے کچھ رقم چرا کر کٹھمنڈو آئی تھی۔ یہاں آ کر چھٹیاں منانا اس کا ایک ارمان تھا۔ اب اپنی دانست میں وہ اپنا یہ..... اور شاید دوسرے بہت سے ارمان پورے کر رہی تھی۔ اس کا باپ، اس کی ماں کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ پنجاب کے کسی شہر کا تھا۔ جسبیر عرف جینائس کو اس کے بارے میں جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ درحقیقت اسے اب کسی بھی فرد، کسی بھی رشتے ناتے اور دنیا کے کسی بھی معاملے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ فی الحال جو نیپالی نوجوان اس کا بوائے فرینڈ تھا، اس کے ساتھ مل کر وہ اپنی دانست میں زندگی سے وہ خوشیاں چھین رہی تھی، جن پر اس کا حق تھا۔ اس لڑکی کے رخصت ہوتے ہی میرے ذہن میں ایک فلم کا دھندلا سا خاکہ بن گیا۔ میں نے اس فلم کا نام بھی اسی وقت سوچ لیا۔ اور وہ نام تھا۔ ''ہرے راما ہرے کرشنا۔'' اس کی ہیروئن کے طور پر میرے ذہن میں جسبیر عرف جینائس ہی کا تصور تھا۔ میں نے نیپال سے رخصت ہونے سے پہلے وہاں کے بادشاہ مہیندرا سے اجازت بھی لے لی کہ میں اس فلم کی شوٹنگ وہیں کروں گا۔ انہوں نے نہ صرف اجازت دی بلکہ یہ تجویز بھی دی کہ میں 'پوکھرا' نامی ایک خوبصورت شہر میں بھی شوٹنگ کروں، جہاں ان کے بھائی پرنس باسوندرا کا ایک شاندار ہوٹل بھی تھا۔

بادشاہ نے یہ بھی کہا کہ ان کے ملک میں کہیں بھی شوٹنگ کے لیے مجھے ان سے اجازت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ شوٹنگ کے دوران وہ پولیس کے کسی انسپکٹر کو میرے باڈی گارڈ کے طور پر ہمراہ کر دیں گے اور وہ انسپکٹر صحیح معنوں میں 'گورکھا' ہوگا۔ 'گورکھا' عام طور پر نیپال کے نہایت سخت جان فوجی اور جنگ و جدل کے ماہر ہوتے تھے۔ میں نے نیپال سے واپسی سے پہلے ہی 'پوکھرا' جا کر ہوٹل اور دیگر لوکیشنز بھی دیکھ لیں۔ ہوٹل واقعی خوبصورت تھا۔ اس کا نام 'فش ٹیل لاج'' تھا اور وہ خوبصورت سبزہ زاروں کے درمیان، دریا کے کنارے واقع تھا۔ وہ لوکیشن سوئٹزرلینڈ کی کسی لوکیشن سے کم نہیں تھی۔ میں نے تین دن اسی ہوٹل میں رہ کر فلم کا ابتدائی اسکرپٹ تیار کر لیا۔

میں نے فلم میں جسبیر عرف جینائس والے کردار کو اپنی بہن بنایا تھا۔ جب میں نے بمبئی پہنچ کر کاسٹ کی تلاش شروع کی تو اندازہ ہوا کہ کوئی ہیروئن میری بہن بننا نہیں چاہتی تھی۔ ہر لڑکی فلم میں میرے مقابل رومینٹک قسم کی ہیروئن ہی کا کردار ادا کرنے کی خواہشمند تھی، حالانکہ میں فلم میں اپنی بہن کا جو کردار تخلیق کر رہا تھا، وہ ہیروئن سے زیادہ اہم اور بڑا تھا۔ فلم کا زیادہ بوجھ اسے ہی اپنے کندھوں پر اٹھانا تھا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

زینت امان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی

دیو آنند، زینت امان

تمکین تبسم

قسط : 26

ان دنوں میں اپنے بھائی گولڈی کی فلم ''تیرے میرے سپنے'' میں ممتاز کے مقابل کام کر رہا تھا۔ ممتاز کی کافی عرصے سے خواہش تھی کہ وہ کسی فلم میں میری ہیروئن بنے۔ وجے عرف گولڈی نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی تھی۔ فلم میں ہماری جوڑی اچھی لگ رہی تھی اور مزاج یا عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی ممتاز مجھے اچھی لگی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں اپنی اگلی فلم نیپال میں شوٹ کرنے والا ہوں تو وہ اس میں بھی دلچسپی لینے لگی۔

ایک روز جب میں اس کے گھر کھانے پر مدعو تھا تو کھانے کے بعد، چائے کے دوران اس نے پوچھا ''کیا میں تمہاری اس فلم میں ہوں جس کی شوٹنگ نیپال میں ہو رہی ہے؟''

''اگر تم اس فلم میں میری بہن کا رول کر سکو تو میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا۔'' میں نے جواب دیا اور اسے قائل کرنے کے لیے فلم کی کہانی بھی سنائی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ بہن کا کردار ہیروئن سے زیادہ اہم تھا..... مگر وہ قائل نہ ہوئی۔ وہ بھی صرف ہیروئن ہی بننا چاہتی تھی۔ اس کا اشتیاق دیکھتے ہوئے میں نے اسے ہیروئن کے طور پر کاسٹ کرنے کی ہامی بھر لی۔ یوں دوسری لڑکی کی تلاش کا مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔

ایک روز میں ہدایتکار امرجیت کے اپارٹمنٹ پر ایک پارٹی میں شریک تھا جس میں اس نے زینت امان نامی ایک لڑکی کو بھی مدعو کر رکھا تھا جو کچھ ہی دن پہلے مس ایشیا منتخب ہوئی تھی۔ اس کا لباس بھی ماڈرن تھا اور اپنے طور طریقوں کے اعتبار سے بھی وہ مجھے کافی ماڈرن دکھائی دی۔ میرے ذہن میں جینائس کا جو تصور تھا، زینت امان مجھے اس کے بہت قریب نظر آئی۔ وہ ایک پُرکشش اور پُراعتماد لڑکی تھی۔

میں نے اسے اپنے پرس سے پیکٹ اور سنہرا لائٹر نکال کر سگریٹ سلگاتے ہوئے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آس پاس موجود لوگوں اور اپنے گرد و پیش کی پروا کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ تعارف ہوا تو مجھے پتا چلا کہ وہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھی اور ایک سال کے لیے اسکالرشپ پر امریکا جا کر مزید تعلیم حاصل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش ماڈرن ماحول میں ہوئی تھی۔

تعارف کے دوران اس نے مجھے بھی سگریٹ پیش کی۔ میں سگریٹ کبھی کبھار پیتا تھا۔ اس وقت اس کی سگریٹ قبول کر لینا مجھے بہتر محسوس ہوا۔ اس نے اپنے لائٹر سے میری سگریٹ سلگائی تو میں نے پہلا کش لے کر دھواں اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔ اس نے برا نہیں منایا بلکہ مسکرا دی۔ پھر اس نے بھی کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ابھر آئی تھی جس کی وجہ سے آنکھیں ستاروں کی طرح جھلملانے لگی تھیں۔

''میری فلم میں کام کرو گی؟'' میں نے بلاتمہید پوچھا۔

''اگر رول اہم ہوا تو.....'' اس نے بھی بلاتامل جواب دیا۔ اس لمحے وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ پُراعتماد دکھائی دی۔

میں نے اسے رول کے بارے میں بتایا اور دوسرے ہی روز اسکرین ٹیسٹ کے لیے بلا لیا۔ اس کا اسکرین ٹیسٹ بھی اچھا رہا۔ یوں میں نے ''ہرے راما ہرے کرشنا'' میں زینت امان کو متعارف کرایا لیکن یہ بات شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ اس سے پہلے درحقیقت میں نے اسے ایک امریکی فلم The Evil Within میں کام دلوایا تھا جس میں، میں ایک ویت نامی اداکارہ کیوچن کے مقابل ہیرو تھا۔

''ہرے راما ہرے کرشنا'' کی شوٹنگ کے لیے میں 84 افراد پر مشتمل یونٹ لے کر نیپال گیا تھا۔ ہم نے لگاتار دس ہفتے، دن رات شوٹنگ کر کے یہ فلم وہاں مکمل کر لی۔ اس تمام عرصے کے دوران وہاں ہماری اس فلم اور اس کی شوٹنگ کی دھوم مچی رہی۔ بادشاہ کے تعاون کی وجہ سے ہمارا کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ اس فلم کا مشہور گانا ''دم مارو دم.....'' ہم نے کٹھمنڈو کے قلب میں ایک مصروف شاہراہ پر پکچرائز کیا۔ اس میں زینت امان کی پرفارمنس دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک نئی اداکارہ تھی۔ اس کے اردگرد موجود لوگ اصل ہپّی تھے۔ ہماری فلم کی شوٹنگ کے دوران کٹھمنڈو میں زیادہ تر جشن کا سا سماں رہا۔

ایس ڈی برمن کے صاحبزادے آر۔ ڈی برمن کی یہ بطور موسیقار پہلی فلم تھی۔ زینت امان بھی اسی فلم کے ذریعہ متعارف ہوئیں۔ آگے چل کر ان دونوں نے فلمی دنیا میں بڑا نام اور مقام بنایا۔ اس فلم میں اصل جسپر عرف جینائس بھی ہپّی لڑکی کے روپ میں نظر آئی تھی۔ اس کا یہ روپ حقیقی تھا۔ فلم کی ریلیز کے بہت عرصے کے بعد مجھے امریکا سے ایک صاحب کا شکریے کا خط آیا۔ اس فلم کی وجہ سے انہیں پتا چلا تھا کہ گھر سے ناراض ہو کر جانے والی ان کی بیٹی کہاں ہے، اور والدین نے اسے تلاش کر لیا تھا۔

میں نے شوٹنگ مکمل کر کے نیپال کے بادشاہ مہیندرا کے محل جا کر تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں دعوت دی کہ فلم کی ریلیز کے موقع پر وہ انڈیا آئیں۔ میرا ارادہ اس موقع پر اپنے ملک کی وزیراعظم اور ان کی کابینہ کو بھی مدعو کرنے کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئیں گے۔

میں اس فلم کی ریلیز کو ایک یادگار اور تاریخ ساز واقعہ بنانا چاہتا تھا لیکن فلم کی ریلیز سے چند دن پہلے میں نے اخبار اٹھایا تو ایک بڑی سی سرخی کو پڑھ کر میرا دل ڈوب سا گیا ''نیپال کے شاہ مہیندرا دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال کر گئے۔''

خبر پڑھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انسان کے بعض ارادے کس طرح دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میں تنہا بیٹھا بہت دیر تک زندگی کے ان اتفاقات کے بارے میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا اور آنسو میری آنکھوں سے بہتے رہے۔

''ہرے راما ہرے کرشنا'' نے زینت امان کو راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا تھا لیکن اس کا یہ سپر اسٹار کا امیج ذرا مختلف سا تھا کیونکہ فلم میں وہ میری بہن بنی تھی۔ میں نے سوچا کہ لوگ کہیں یہ توقع نہ کرنے لگیں کہ اب وہ ہر فلم میں میری، یا کسی اور ہیرو کی بہن ہوا کرے گی۔ ہماری فلم انڈسٹری میں بہت سے اداکاروں پر کوئی مخصوص چھاپ لگ جاتی ہے۔ زینت امان کو اس طرح کی کسی چھاپ سے بچانے کے لیے میں نے اسے ''ہیرا پنا'' میں کاسٹ کیا۔ اس فلم کی شوٹنگ ہانگ کانگ اور ساؤتھ انڈیا میں ہوئی۔

پہاڑ مجھے ہمیشہ بہت متاثر کرتے ہیں۔ اپنی آئندہ فلم ''عشق عشق عشق'' کی شوٹنگ کے لیے میں نے بھوٹان کو منتخب کیا جو دنیا کے بلند ترین، برف پوش پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی، خوبصورت بادشاہت تھی۔ ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے میں نے تین دن تک اِدھر اُدھر پرواز کر کے شوٹنگ کے لیے جگہیں منتخب کیں۔ میں ایک غیرملکی صحافی دوست ڈیسمنڈ ڈوبیگ کے توسط سے بھوٹان کے نئے بادشاہ جگمے سنگے سے ان کی تاجپوشی کے موقع پر ملا۔

ہم نے اس تقریب اور بادشاہ کے قلعہ نما محل پر ایک دستاویزی فلم بنا کر بادشاہ کو پیش کی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ہمیں اپنی خوبصورت راجدھانی میں شوٹنگ کے لیے ہر سہولت فراہم کی۔ یوں میں نے انڈیا کی سرحد سے جڑی ہوئی تینوں خوبصورت، پہاڑی ریاستوں سکم، نیپال اور بھوٹان میں اپنی فلموں کی شوٹنگ کر کے ایک قسم کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ ان علاقوں کے بعض مقامات بلاشبہ سوئٹزرلینڈ سے زیادہ خوبصورت تھے۔

''عشق عشق عشق'' شبانہ اعظمی کی پہلی کمرشل فلم تھی۔ میں نے اسے انتہائی خوبصورت فطری مناظر سے آراستہ ایک رومانی فلم بنانے کے لیے بے پناہ محنت کی، اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور میری نظر میں یہ بلاشبہ ایک نہایت خوبصورت اور شاعرانہ قسم کی فلم تھی لیکن کاروباری طور پر یہ بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اس میں میرے بھتیجے شیکھر کپور نے پہلی بار ایک اداکار کے طور پر کام کیا تھا۔ وہ آج کل بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈائرکٹر ہے۔

دیو آنند ''کمکشنرز'' کے سیٹ پر

''عشق عشق عشق'' کاروباری طور پر ناکام سہی، لیکن اس نے بھی ایک سپر اسٹار کے طور پر زینت امان کے مقام کو مستحکم کرنے میں مدد دی۔ ان فلموں کی تکمیل کے دوران زینت امان سے میری قربت کافی بڑھ چکی تھی اور اخباروں رسالوں میں ہمارے درمیان کسی خاص تعلق کی اسی قسم کی چٹخارے دار خبریں چھپنے لگی تھیں جنہیں قارئین کی بہت بڑی تعداد نہایت دلچسپی سے پڑھتی ہے۔ میں زینت امان کی کامیابیاں اور مقبولیت دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتا تھا جس طرح کوئی مصور اس وقت خوش ہوتا ہے جب اس کی پینٹنگ کو سراہا جاتا ہے۔

ہمارے بارے میں جو افواہیں اُڑنے لگی تھیں، ان میں کسی حد تک حقیقت کا عنصر بھی تھا۔ ہم واقعی ایک دوسرے کے ساتھ کچھ جذباتی وابستگی محسوس کرنے لگے تھے۔ کلکتہ کے ایک سینما ہاؤس میں ''ہرے راما ہرے کرشنا'' کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں دیگر لوگوں کے ساتھ میں اور زینت امان بھی پہنچے ہوئے تھے۔ پاپ سنگر اوشا اتھپ اسٹیج پر ''دم مارو دم.....'' سنا رہی تھی۔ زینت امان حاضرین کی صفوں میں بیٹھی تھی۔

حاضرین گانے سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے اور اوشا اتھپ کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک موقع پر اوشا اسٹیج سے اتری اور زینت امان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اسٹیج پر لے گئی۔ ان کے ساتھ بہت سے حاضرین بھی اسٹیج پر چڑھ گئے۔ وہ سب ناچ گا رہے تھے۔ اوشا کی آواز ان کی آوازوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران لوگوں نے زینت امان کو اٹھا کر اپنے سروں سے بھی اونچا کر دیا۔ زینت امان کے لیے ان کا والہانہ پن قابل دید تھا لیکن میں ایک طرف بیٹھا اپنے دل میں حسد و رقابت کی ہلکی سی لہر محسوس کر رہا تھا۔

مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے زینت کو اس مقام تک میں نے پہنچایا ہے، وہ صرف میری ہے۔ میں سوچ رہا تھا، یہ نامعلوم لوگ بھلا کیوں اس پر قربان ہوئے جا رہے تھے؟ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میرا اس طرح سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں..... اس کے باوجود میں اس احساس اور اس سوچ کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا۔

اس کے تقریباً دو سال بعد میٹرو سینما میں ''عشق عشق عشق'' کے پریمیئر کے موقع پر راج کپور نے تمام مہمانوں کے سامنے زینت امان کو اس کی پرفارمنس پر داد دینے کے لیے چوم لیا۔ مجھے اس موقع پر کچھ فخر بھی محسوس ہوا کیونکہ راج کپور کسی کو داد دینے اور سراہنے کے معاملے میں منافقت نہیں کرتے تھے۔ انہیں اگر کسی کی پرفارمنس پسند آتی تھی تو کھل کر اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں داد دیتے تھے۔ ان کا زینت امان کو داد دینا ایک طرح سے مجھے داد دینے کے مترادف بھی تھا کیونکہ زینت کو متعارف کرانے والا میں تھا..... چنانچہ میں نے اس داد پر فخر تو محسوس کیا لیکن داد دینے کے بے تکلفانہ انداز پر کچھ حسد بھی محسوس ہوا۔

اس قسم کے واقعات پیش آتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں زینت امان کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ میرے دل میں یہ خواہش شدت سے بیدار ہو گئی کہ میں یہ بات اسے بھی بتا دوں۔ اپنی محبت اس پر ظاہر کر دوں۔ میں نے اسے فون کر کے ''تاج'' ہوٹل کے ایک ہال میں ملاقات طے کی۔ یہ ہال بلندی پر تھا۔ شیشے کی دیوار سے شہر کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ وہاں روشنی بہت کم ہوتی تھی۔ کھانے کی میزوں پر شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ اظہار محبت کے لیے وہ ماحول اور وہ جگہ بہترین تھی۔

زینت نے میرے ساتھ وہاں ڈنر کرنے کی ہامی بھر لی لیکن اس رات وہاں جانے سے پہلے ہمیں ایک پارٹی میں بھی شرکت کرنی تھی۔ مقررہ وقت پر میں نے اسے اس کے گھر سے اپنی گاڑی میں ساتھ لیا اور پہلے ہم پارٹی میں چلے گئے۔ وہاں جس شخص سے، سب سے پہلے ہمارا سامنا ہوا وہ راج کپور تھے.....

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

"عشق عشق" میں زینت امان، دیو آنند (1974ء)

بیٹے سنجیو اور بیٹی دیویا کے ساتھ

تمکین تبسم

قسط : 27

راج کپور اس وقت پیے ہوئے تھے اور خاصی ترنگ میں تھے۔ زینت امان کو دیکھ کر خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں اور وہ بے تکلفی سے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولے۔ ''اچھا ہوا تم آ گئیں۔'' ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

ابھی میں یہی دیکھ کر حیران تھا کہ راج کپور کا یک زینت امان سے اتنے بے تکلف کیوں ہو گئے تھے، کہ مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا زینت امان کے ردِعمل کی وجہ سے لگا تھا۔ راج کپور کے بے تکلفانہ انداز پر زینت امان نے کسی قسم کی ناگواری یا حیرت ظاہر کرنے کے بجائے جواباً خاصی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ ان کے پاؤں چھونے کے لیے بھی جھک گئی۔ اس کے بعد اس نے ذرا شرمسار سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میرے دل میں ایک مبہم سے شک نے سر ابھارا۔ پچھلے دنوں میں نے اڑتی اڑتی سی خبر سنی تھی کہ زینت امان، راج کپور کے اسٹوڈیو میں، ان کی آنے والی فلم ''ستیم شیوم سندرم'' کے لیے اسکرین ٹیسٹ دینے گئی تھی۔ زینت کا جو انداز میں اس وقت دیکھ رہا تھا، اس کی وجہ سے مجھے یہ خبر سچ لگنے لگی۔ زینت امان کا انداز تو فلم سائن کرنے سے بھی کچھ آگے کی کہانی سنا رہا تھا۔ میرا دل یکدم زخمی سا ہو گیا۔ میں خواہ مخواہ ہی کچھ ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے زینت میری اور صرف میری ہے۔ مجھے دل ہی دل میں زینت امان سے محبت ہو گئی تھی۔

ادھر راج کپور نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں زینت امان سے کہہ رہے تھے ''تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تم ہمیشہ صرف سفید ساڑھی میں میرے سامنے آیا کرو گی۔ تم نے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔''

گو کہ اس وقت راج کپور نے میرا ہاتھ بھی نہایت گرمجوشی اور مضبوطی سے دبایا ہوا تھا لیکن مجھے ان کا اپنائیت کا یہ انداز بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دل

دیو آنند، زینت امان ''ہرے راما ہرے کرشنا'' میں (1971ء)

جیسے کسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ منہ چھپا کر وہاں سے بھاگ جاؤں اور کسی گوشۂ تنہائی میں کچھ دیر خاموش بیٹھ کر یا پھر آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ میری انا سخت مجروح ہوئی تھی اور زینت میرے لیے اب وہ زینت نہیں رہی تھی جو چند لمحے پہلے تک تھی۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں اتنے احمقانہ انداز میں کیوں سوچ رہا تھا؟ میں نے کون سا زینت امان کو بتایا تھا کہ میرے دل میں اس کے لیے کیسے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس نے بھی مجھ سے کوئی عہد و پیماں نہیں کیے تھے۔ ابھی تک ہمارے درمیان محض پیشہ ورانہ تعلقات ہی تو تھے۔ میں ایک پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھا، وہ ایک اداکارہ تھی۔ میں نے اسے متعارف ضرور کرایا تھا اور ایک اسٹار بھی بنایا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اسے بتائے بغیر ہی، دل ہی دل میں اسے چاہنے لگتا اور پھر امید رکھتا کہ وہ بھی جواباً اسی طرح مجھے اپنے من مندر میں بٹھا کر میری پوجا کرے گی اور کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔

قدرت کی یہ مجھ پر عنایت تھی کہ جذباتی صدموں سے میں جلد سنبھل جاتا تھا۔ اس وقت بھی چند لمحوں کے لیے میرا دل خون کے آنسو ضرور رویا..... لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال لیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا ''بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ.....''

اپنی آواز پر قابو رکھتے ہوئے میں نے کافی حد تک ہموار لہجے میں زینت امان سے پوچھا۔ ''تم یہاں کب تک رُکو گی؟''

زینت نے یوں راج کپور کی طرف دیکھا جیسے وہاں سے روانہ ہونے کے لیے ان کی اجازت طلب کر رہی ہو۔ راج کپور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''اسے یہیں رہنے دو دیو..... اور تم بھی رُکو..... پارٹی تو ابھی چل رہی ہے۔ انجوائے کرو۔''

''انجوائے کرنے کے لیے میں زینت کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں.....'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر زینت کو مخاطب کیا۔ ''وقت ملے تو کل مجھے فون کر لینا۔''

''لیکن ہمیں تو اکٹھے ایک اور جگہ جانا تھا.....'' زینت امان نے گویا مجھے یاد دلایا تاہم اس کا لہجہ رسمی سا تھا۔

''کوئی بات نہیں..... وہاں کسی اور دن چلے جائیں گے۔'' میں نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔ میرے لیے اب اسے ساتھ لے کر تاج ہوٹل جانا بے معنی ہو چکا تھا۔ میزبان سے معذرت کر کے میں فوراً ہی وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے زینت امان کو ساتھ لے جا کر صرف اپنے دل کا حال ہی نہیں سنانا تھا بلکہ میرے ذہن میں ایک اور فلم کے لیے کہانی کا آئیڈیا بھی تھا۔ اس فلم میں، میں اسے ہیروئن کے طور پر کاسٹ کرنا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ فلم اسے شہرت و مقبولیت کی ان بلندیوں پر پہنچا دے گی جن کا اس نے شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ لیکن قدرت کو شاید یہ سب کچھ منظور نہیں تھا۔

مجھے زینت سے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ ہی میں اس کے بارے میں اپنے دل میں غم و غصہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے اسے بتائے بغیر ہی اپنے دل میں بٹھا کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی..... اور جب بتانے کا ارادہ کیا تو شاید دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اسے دنیا سے متعارف کرایا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مجھ سے محبت بھی ضرور کرتی۔ وہ فلمی دنیا میں زیادہ سے زیادہ آگے جانے کے لیے آزاد تھی اور اس سلسلے میں اسے جب کسی سے بھی سہارا ملنے کی امید ہوتی، وہ اس سے رسم و راہ بڑھا سکتی تھی۔ مجھے اس پر غمزدہ یا دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں تب بھی زینت امان کی ایک روشن سی اور مسکراتی ہوئی تصویر میری آنکھوں کے سامنے رہی۔ پھر دوسری تصویر راج کپور کی ابھر آئی۔ میں راج کپور کو بھی پسند کرتا تھا۔ وہ ایک نہایت باصلاحیت پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھے۔ فلموں سے انہیں واقعی عشق تھا اور وہ میرے دوست بھی تھے۔ آنکھیں بند کر کے ان دونوں کے بارے میں سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے میرے ذہن میں ایک اور فلمی کہانی کا خاکہ ابھرنے لگا.....

o.....o.....o

میں اپنے اوپر ایک گانے کے بول پکچرائز کرا رہا تھا۔ اس کی دھن آر۔ ڈی برمن نے بنائی تھی۔ آخری بول ختم ہوا تو فلم کے ڈائریکٹر اور میرے بھائی وجے آنند نے ''کٹ'' کہا۔ میں کیمرے کے سامنے سے ہٹا تو ایک نسوانی آواز سنائی دی ''ویری گڈ شاٹ!''

آواز ان لڑکیوں کے گروپ کی طرف سے آئی تھی جو شوٹنگ دیکھنے کے لیے ایک ٹولی کی صورت میں ایک طرف کھڑی تھیں۔ انہوں نے شاٹ اوکے ہونے پر تالیاں بھی بجائی تھیں۔ جس لڑکی نے سب سے بلند آواز میں ''ویری گڈ شاٹ'' کہا تھا، میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی اپنے گروپ سے الگ ہو کر میری طرف چلی آئی اور آٹوگراف بک میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آٹوگراف پلیز.....''

میں نے آٹوگراف بک کے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے تو وہ سب کے سب سادہ تھے۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس میں تو اور کوئی آٹوگراف ہی نہیں ہے.....''

بیضوی چہرے والی وہ سادہ و معصوم سی نوجوان لڑکی اطمینان سے انگریزی میں بولی۔ ''اس میں کوئی اور آٹوگراف اس لیے نہیں ہے کہ یہ میں نے آج ہی نئی خریدی ہے..... خاص طور پر آپ سے آٹوگراف لینے کے لیے.....''

اس سے مختصر سی بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ وہ حال ہی میں کالج میں داخل ہوئی ہے اور اس نے ''مس فوٹو جینک'' کا ٹائٹل جیتا ہے۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ کیمرے سے اس کی تصویر واقعی بہت اچھی آتی ہو گی۔ میں نے ان ہی دنوں ایک نیا اسکرپٹ مکمل کیا تھا۔ اسے ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے اچانک ایک خیال آیا اور میں نے اسے اپنی آئندہ فلم میں کام کرنے کی پیشکش کر دی۔ وہ فلموں میں کام کرنے کی کچھ زیادہ خواہشمند نہیں تھی مگر میرے تھوڑے سے اصرار پر مان گئی۔

اس کی عمر صرف سولہ سال اور مسکراہٹ بے حد دلکش تھی۔ اس کا اسکرین ٹیسٹ لیا گیا اور میں نے اسے اپنی آنے والی فلم ''دیس پردیس'' کی ہیروئن منتخب کر لیا۔ یہ ٹینا منیم تھی جو چند سال فلموں میں کام کرنے کے بعد امبانی فیملی میں شادی کر کے رخصت ہو گئی۔ وہ اب ٹینا امبانی کہلاتی ہے۔ امبانی فیملی انڈیا کے امیر ترین خاندانوں میں سے ایک ہے۔

زینت امان

o.....o

تاریخ کا دھارا بہتا رہتا ہے۔ وہ اندرا گاندھی کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ خاتون جنہیں کبھی ''گونگی گڑیا'' کہا جاتا تھا، وہ اب ''خاتون آہن'' کہلاتی تھیں۔ ملک کی سیاست مکمل طور پر ان کی اور ان کے بیٹوں کی گرفت میں تھی۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ اندرا گاندھی ''انڈین نیشنل کانگریس'' کے پلیٹ فارم سے ابھری تھیں لیکن اب انہوں نے اس سے الگ ہو کر اپنی ''اندرا کانگریس'' بنائی تھی جس کے یوتھ ونگ نے اندرا گاندھی کے چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی کا امیج کچھ ایسا بنانا شروع کر دیا تھا جیسے ملک کے آئندہ وزیراعظم وہی ہوں گے۔

اسی یوتھ ونگ کی ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی بمبئی آئی ہوئی تھی اور فلمی دنیا کے ایسے لوگوں سے ملاقاتیں کر رہی تھی جو عوام میں مقبول تھے۔ دراصل سنجے گاندھی دہلی میں ایک بہت بڑا جلوس نکالنے والے تھے۔ اس لڑکی کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ جلوس اور اس کے بعد جلسے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت یقینی بنانے کے لیے فلمی شخصیات کو بھی مدعو کیا جائے اور تاثر دیا جائے کہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی طرح فلمی دنیا کے لوگ بھی اندرا کانگریس کے ساتھ تھے۔ سیاسی جماعتیں اپنی مقبولیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا چڑھا کر دکھانے کے لیے اس قسم کے طریقے اختیار کرتی رہتی ہیں۔

اس لڑکی نے اپنی من موہنی گفتگو سے مجھے اس جلوس اور جلسے میں شرکت کے لیے آمادہ کر لیا۔ میں جب دہلی پہنچا تو میں نے اپنے دوست دلیپ کمار کو بھی وہاں موجود پایا۔ انہیں بھی میری ہی طرح مدعو کیا گیا تھا۔ اندرا کانگریس کی بڑی بڑی سرکاری اور غیر سرکاری شخصیات بھی موجود تھیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جلسے جلوس کی تیاریاں بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی تھیں اور اندرا گاندھی اپنی سیاسی طاقت کا بھرپور اظہار کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ ان کا سیاسی وارث، جانشین یا ''گدی نشین'' کون ہو گا۔

ہم جب جلسے میں پہنچے تو وہاں سیاسی ہتھکنڈے پوری طرح زیرِ عمل تھے۔ نعرے لگ رہے تھے ''دیش کا نیتا..... سنجے گاندھی۔'' سنجے گاندھی کو ملک کا لیڈر، رہنما اور نہ جانے کیا کچھ قرار دیا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ مجھے یہ سب کچھ بالکل اچھا نہیں لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ملک میں سنجے گاندھی کے سوا کوئی سیاسی رہنما ہی نہیں رہا تھا۔ میں وہاں بیٹھا، ملکی سیاست کے طور طریقے دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔

میں اور دلیپ کمار جب جلسے کی جگہ سے رخصت ہونے لگے تو ہم سے فرمائش کی گئی کہ ہم ٹی وی اسٹیشن چلیں اور وہاں یوتھ کانگریس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں جن میں خاص طور پر یہ بتانے کی کوشش کی جائے کہ آئندہ ملک کی قیادت کے لیے سنجے گاندھی موزوں ترین آدمی تھے۔ دلیپ کمار بھی اس مقصد کے لیے ٹی وی اسٹیشن جانے سے کترا رہے تھے جبکہ میں نے تو بالکل صاف اور دوٹوک انداز میں انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ کے لیے سرکاری ٹی وی پر میری کوئی بھی فلم دکھانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ فلم تو دور کی بات تھی، کسی خبر کے ساتھ یا کسی بھی سلسلے میں میری تصویر بھی ٹی وی پر دکھانے پر پابندی لگا دی گئی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

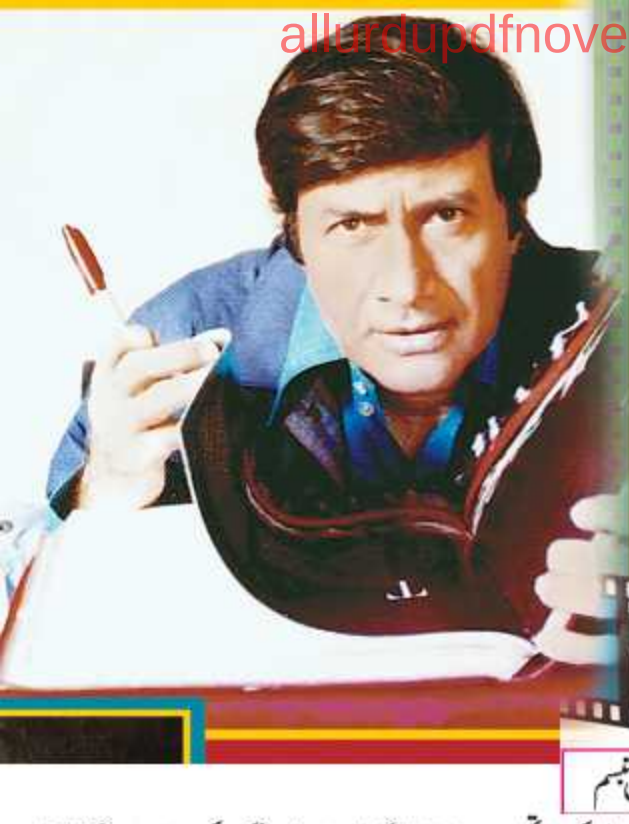

حکومت کے آمرانہ رویّے نے مجھے سیاست میں دھکیل دیا

تمکین تبسم

قسط : 28

حکومتی پارٹی اندرا کانگریس کے یوتھ ونگ نے سرکاری ٹی وی چینل پر میری کوئی فلم، میرے بارے میں کوئی خبر یا میری تصویر چلنے پر جس طرح پابندی لگائی تھی، ایسی ہی پابندی اداکار اور گلوکار کشور کمار پر بھی لگائی گئی کیونکہ جس طرح میں نے ٹی وی پر جا کر سنجے گاندھی کے بارے میں تعریفی انٹرویو دینے اور اسے ملک کا عظیم لیڈر قرار دینے سے انکار کر دیا تھا، اسی طرح کشور کمار نے بھی سنجے گاندھی کے جلسے میں جا کر گانا گانے سے انکار کیا تھا۔

مجھے فنکاروں کے ساتھ اس آمرانہ سلوک پر سخت غصہ آیا۔ یہ اس ملک کی جمہوری حکومت کا رویہ تھا جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کہلاتا تھا۔ میں نے دہلی میں وزارت اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر کو فون کر کے ان سے ملاقات کا وقت لیا۔ انہوں نے خاصی خوش خلقی سے میرا استقبال کیا۔ وہ میری آمد کا مقصد سمجھ گئے تھے، اس لئے انہوں نے خود ہی بلا تمہید اصل موضوع پر بات چیت شروع کر دی اور بولے ”آپ کو حکومت اور سنجے گاندھی کی تعریف میں دو چار جملے بولنے میں کیا پریشانی تھی؟“

”ہم ایک جمہوری ملک میں رہ رہے ہیں یا پولیس اسٹیٹ میں“؟ میں نے الٹا ان سے سوال کر دیا۔ میری ان سے جرح بازی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں انہوں نے مجھے وہی گول مول سا جواب دیا جو اس قسم کے معاملات میں عموماً وزیر سفیر، مجھ جیسے شکایت کنندگان کو دیا کرتے ہیں۔ یعنی ”ٹھیک ہے..... میں اس معاملے کو دیکھوں گا۔“

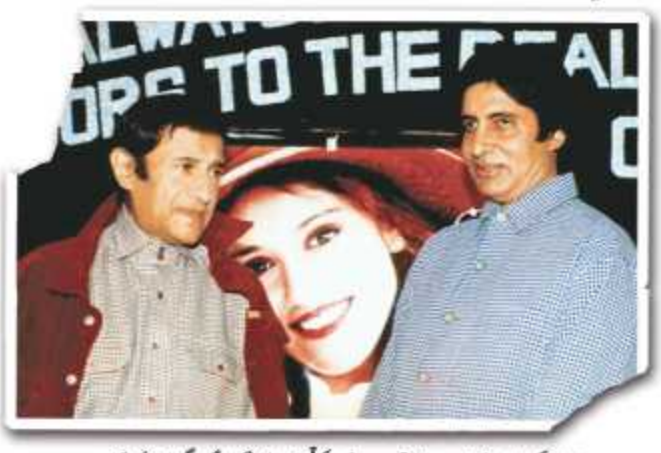

اجتا بھوپکن اور دیو آنند..... اتفاق سے دونوں کی قمیضوں کا رنگ الگ، مگر ڈیزائن ایک ہے

ایک تقریب میں دیو آنند، ان کے بھائی وجے آنند عرف گولڈی اور اشوک کمار

ساتھ ہی انہوں نے نہایت نرم لہجے میں مجھے نصیحت بھی کر دی ”میرا آپ کو مشورہ یہی ہے کہ آپ اتنے ضدی نہ بنیں اور اس قسم کے معاملات میں ایسا جارحانہ رویہ نہ اپنائیں۔“

”مشورے کا شکریہ وزیر صاحب!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا اور ان کے دفتر سے چلا آیا۔ بمبئی آ کر میں نرگس سے ملا جو گاندھی فیملی کے کافی قریب تھی۔ میں نے اسے ساری صورت حال بتائی تو اس نے بھی وزیر اطلاعات سے ملتے جلتے انداز میں کہا ”آپ کو اتنا ضدی بننے اور حکومت کی اتنی سختی سے مخالفت کرنے کی کیا ضرورت ہے“؟

ہم اس وقت ایک پارٹی میں تھے۔ میں نے اس کے بعد نرگس سے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں حکومت اور سنجے گاندھی کی نظروں میں ناپسندیدہ ہو چکا ہوں اور مجھے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

ایمرجنسی کے نفاذ نے ملک میں کچھ نظم وضبط تو پیدا کیا لیکن لوگوں کے جذبات کا آتش فشاں اندر ہی اندر کھولنے لگا جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ اسے پھٹنے کا موقع اندرا گاندھی نے خود ہی فراہم کر دیا۔ اپنے خیال میں وہ اپنے تمام مخالفوں سے اپنی ہاتھ سے نمٹ چکی تھیں۔ بہت سے ”سرکشوں“ اور ”سرپھروں“ کو جیلوں میں ڈالا جا چکا تھا۔ بہت سے انڈر گراؤنڈ ہو چکے تھے۔ چنانچہ اندرا گاندھی نے سمجھا کہ حالات ان کے حق میں بالکل موافق ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ایمرجنسی اٹھالی اور انتخابات کا اعلان کر دیا۔

الیکشن کا اعلان ہوتے ہی ان کے وہ تمام مخالفین میدان میں کود پڑے جو بظاہر غائب ہو چکے تھے۔ پورے ملک میں گویا بیداری کی لہر دوڑ گئی اور ملک میں زبردست گرما گرمی پیدا ہو گئی۔ انڈیا میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک کے بعد سے اب تک ایسا جوش وخروش اور ہیجان دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ بہت سے سیاسی رہنما جو ایمرجنسی کے دوران ملک سے فرار ہو گئے تھے، ایمرجنسی ہٹتے ہی لوٹ آئے۔

ان میں بمبئی کے مشہور فوجداری وکیل رام جیٹھ ملانی بھی تھے جو امریکا سے پہلی پرواز پکڑ کے واپس آ گئے۔ انہوں نے نو تشکیل شدہ ”جنتا پارٹی“ کے پلیٹ فارم سے، بمبئی کے ایک حلقے سے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ جے پرکاش نارائن نے اس پارٹی کے ذریعے پورے بھارت کے عوام کو اندرا گاندھی کے خلاف متحرک کر رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انتخابات نہایت ڈرامائی ہوں گے۔ یقین سے کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔ امکان یہ بھی نظر آتا تھا کہ ”خاتون آہن“ کا تختہ الٹ جائے گا اور یہ بھی ممکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوبارہ اقتدار میں آ جائیں۔

فلم انڈسٹری کے زیادہ تر لوگ اندرا گاندھی کے حامی تھے۔ مشرقی ممالک میں اکثر یہی صورت حال دیکھنے میں آتی ہے کہ ان کی فلم انڈسٹری حکومت وقت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ فلم انڈسٹری کے لوگ بے چارے حکومت کی مخالفت کے متحمل نہیں ہو سکتے اور سختیاں نہیں سہہ سکتے بلکہ اکثر وہ بھی شخصیت پرستی کے سحر میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ لوگ حکومتی مشینری کے مسلسل پروپیگنڈے سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں۔ بہت کم فلمی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف اپنی جان، مال اور آسائشوں کے تحفظ کے لئے حکومت وقت کی ہاں میں ہاں ملانے میں عافیت سمجھتے ہیں۔

ان حالات میں رام جیٹھ ملانی مجھ سے ملنے آئے۔ ان کی جنتا پارٹی ایک بہت بڑا جلسہ کر رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس میں شرکت کروں اور ان کے حق میں بولوں۔ میں نے انہیں کوئی واضح جواب دیئے بغیر رخصت کر دیا۔ میں نے دفتری قسم کے کاموں اور ملاقاتوں کے لئے ایک ہوٹل میں سوئٹ لے رکھا تھا۔ رام جیٹھ ملانی سے میری ملاقات اسی سوئٹ میں ہوئی تھی۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ہمارا ملک اس وقت ایک عجیب دوراہے پر کھڑا ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بھی اپنے ملک ہی کی طرح ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا راستہ اختیار کروں۔ میں پہلے ہی حکومت وقت کی نظر میں ایک ناپسندیدہ شخص قرار پا چکا تھا اور کئی مسائل کا سامنا کر رہا تھا۔ حکومت کی سب سے بڑی مخالف جماعت کے جلسے میں شرکت کرنا اپنی شامت کو دعوت دینے والی بات تھی۔ عین ممکن تھا کہ عنقریب ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں اندرا گاندھی ہی دوبارہ برسر اقتدار آ جائیں۔ اس صورت میں وہ، ان کی پارٹی اور ان کے لاڈلے بیٹے سنجے گاندھی میری زندگی اجیرن کر دیتے۔ شاید ایک پروڈیوسر اور فلم اسٹار کے طور پر میرا کیریئر ہی ختم ہو جاتا۔

میں نے جواب دینے کے لئے رام جیٹھ ملانی سے ایک دن کی مہلت مانگی تھی۔ وہ میری زندگی کی ایک کٹھن رات تھی۔ تمام رات میں اپنے گھر کے پچھلے باغیچے میں ٹہلتا رہا، سوچ بچار کرتا رہا اور کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین فیصلہ تھا۔ صبح کا اجالا نمودار ہوا تو مجھے نیند آ گئی۔ جب میں سو کر اٹھا تو فوراً ہی فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں نے جنتا پارٹی کے جلسے میں شرکت کی۔ وہ میرے لئے ایک یادگار تجربہ تھا۔ اتنے بڑے مجمع کا میں نے زندگی میں کبھی سامنا نہیں کیا تھا۔ میں جب اسٹیج پر پہنچا تو لوگوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ میں نے مختصر سی تقریر کی لیکن لوگوں نے اتنی دیر تک تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے لوگوں کے اس ردعمل سے بے پناہ حوصلہ ملا اور سخت گیر حکومت وقت کی مخالفت کے لئے کھڑے ہونے کے سلسلے میں اگر میرے دل میں تھوڑا بہت خوف تھا تو وہ دور ہو گیا۔

دوسرے روز بہت سے اخبارات میں میری تقریر کی خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی کیونکہ میں نے ان جذبات کی ترجمانی کی تھی جو ان دنوں لوگوں کی اکثریت کے دلوں میں مچل رہے تھے اور امنڈ پڑنے کے لئے بے تاب تھے۔ انتخابات ہوئے تو جنتا پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ اندرا کانگریس کو عبرتناک شکست ہوئی اور ملک پر سے اندرا گاندھی کی آہنی گرفت ہٹ گئی۔ لوگوں نے اس بات پر میری بھی بہت پزیرائی کی کہ میں نے تن تنہا فلم انڈسٹری کی نمائندگی کرتے ہوئے ملکی سیاست میں جرأت مندانہ کردار ادا کیا۔

مجھے نئی دہلی میں منعقد ہونے والے بہت بڑے جلسے میں بھی مدعو کیا گیا جہاں سے ہم مہاتما گاندھی کی سمادھی پر خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے گئے۔ وہاں لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے درمیان میں بھی جنتا پارٹی اور اس کی اتحادی پارٹیوں کے سرکردہ لیڈروں اٹل بہاری واجپائی، لال کرشن ایڈوانی اور جے پرکاش نارائن وغیرہ کے شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ وہیں ملک کے آئندہ وزیر اعظم کے نام کا اعلان بھی کیا جانا تھا۔ قرعۂ فال مرار جی ڈیسائی کے نام نکلا۔

بدقسمتی سے جنتا پارٹی اور اس کے اتحادیوں کی حکومت اپنی مدت بھی پوری نہیں کر سکی۔ وہ لوگ عوام کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے۔ انہوں نے بس اس تاثر کو مضبوط کیا کہ سیاستدان درحقیقت لالچی، موقع پرست اور کرپٹ لوگ ہوتے ہیں جو صرف لوٹ مار کرنے اور اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لئے سیاست کو سیڑھی بنا کر حکومت میں آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی حرکتوں سے لوگوں کو احساس دلایا کہ انڈیا پر گاندھی خاندان ہی بہتر انداز میں حکومت کر سکتا تھا اور انہی کی پارٹی ملک کو صحیح طور پر چلا سکتی تھی۔

اندرا گاندھی بہترین موقع شناس تھیں۔ وہ شکست کے صدمے سے سنبھل کر، اپنی توانائیاں سمیٹ کر دوبارہ میدان میں کود پڑیں اور انہوں نے جنتا پارٹی کو قبل از وقت انتخابات کرانے پر مجبور کر دیا۔ فلم انڈسٹری کی طرف سے جنتا پارٹی کا ساتھ دینے پر میری پوزیشن بھی بہت خراب ہوئی۔ ایک شام ملک کی سیاسی صورت حال پر غور کرنے کے لئے ہم فلم انڈسٹری کے کچھ لوگ ایک ہوٹل میں جمع ہوئے۔

ہم لوگوں نے کافی حد تک فلمی انداز میں ہی یہ سوچا کہ ایک سیاسی پارٹی کا ساتھ دے کر تو ہمیں کافی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی اور ملک کا بھی کچھ بھلا نہیں ہوا تھا، کیا اپنی ساکھ بحال کرنے اور ملک کی خدمت کرنے کے لئے ہم اپنی کوئی پارٹی نہیں بنا سکتے تھے؟ آخر کار سب لوگ ایک نئی پارٹی بنانے پر متفق ہو گئے۔ اس کا نام ”نیشنل پارٹی آف انڈیا“ رکھا گیا۔ سب لوگوں کو اس بات کا بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ مجھ میں ایک لیڈر بننے کے جراثیم خاطر خواہ تعداد میں پائے جاتے تھے، چنانچہ مجھے ہی اس ”نوزائیدہ“ پارٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کو سیاست میں آگے لایا جائے جو واقعی ملک کے لئے کچھ کرنے کے اہل ہوں، جن میں کچھ نہ کچھ خوبیاں اور کوئی خاص قابلیت ہو۔ ملک کے موجودہ سیاسی نظام میں تو اہل، ایماندار اور قابل لوگوں کے، آگے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ شاطر اور چالاک لوگ جو سیاست کی ابتدائی سختیاں سہہ سکتے تھے، مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرنا اور لوگوں کو بے وقوف بنانا یا ان کی نفسیات سے کھیلنا جانتے تھے، وہ سیاست میں آگے آ جاتے تھے اور انہی میں سے بہت سے لوگ بڑے بڑے مناصب تک پہنچ جاتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ان طور طریقوں کو بدلنے کے لئے کچھ کیا جائے۔ ہم ایک خاص آئیڈیالوجی لے کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

ہم نے پہلا جلسہ شیواجی پارک میں منعقد کیا، جو پورے کا پورا حاضرین سے بھر گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ لوگ ہماری آئیڈیالوجی کی تکمیل کے لئے ہمارے شانہ بہ شانہ چلنے کو بے تاب تھے۔ اس پہلی کامیاب کوشش سے حوصلہ پا کر ہم نے فیصلہ کیا کہ اگلا جلسہ دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ میں کریں گے۔ اندرا گاندھی ان دنوں بمبئی میں تھیں۔ ہمیں اڑتی اڑتی خبر ملی کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ ملانے کی خواہشمند ہیں۔ ہم بھلا ان کے ساتھ کیسے مل سکتے تھے؟ ہمارے آئیڈیاز، ہمارے خیالات اور ہماری منزل تو کچھ اور ہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ہی ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں اور ہم ہی ملک میں وہ انقلاب لا سکتے ہیں جس کے بعد عام آدمی کی حالت بدل جائے گی۔ میں نے اپنا لائحہ عمل بھی تیار کر لیا تھا۔ ہم بڑے جوش وخروش سے اپنی دانست میں ایک بہت بڑے انقلاب کے راستے پر گامزن ہو چکے تھے۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

مجھے اسی لڑکی کی تلاش تھی

تحسین نسیم

قسط : 29

اپنی پارٹی کا منشور بھی میں نے خود ہی تیار کیا تھا اور اس میں نہایت انقلابی قسم کے عزائم ظاہر کیے تھے۔ مثلاً..... ہم ذات پات، رنگ و نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر، باصلاحیت اور قابل لوگوں کو آگے لائیں گے۔ ہم اپنے عوام کا معیار زندگی ترقی یافتہ مغربی ملکوں کے برابر لائیں گے۔ ناخواندگی کو بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ کام پر، یا آفس جانے والا ہر شخص پاجامہ یا پتلون پہنے گا۔ دھوتی صرف گھر پر پہننے کی چیز ہوگی۔ خاص طور پر کوئی سربراہ مملکت آئندہ دھوتی پہن کر مارچ پاسٹ کی سلامی نہیں لے گا۔ مجھے یہ منظر بہت بُرا لگتا تھا کہ ہمارا کوئی صدر یا وزیراعظم بیرون ملک جا کر مارچ پاسٹ کی سلامی لے رہا ہوتا تھا اور اس کی دھوتی ہوا میں اُڑ رہی ہوتی تھی۔ اس کی بدنما ٹانگیں دنیا بھر میں ٹی وی پر دیکھی جا رہی ہوتی تھیں۔

میں نے پارٹی کے منشور میں یہ عزم بھی ظاہر کیا تھا کہ ہم ملک کے تمام دیہات کو اس طرح خوبصورت بنا دیں گے جس طرح مغربی ممالک کے ٹاؤن ہوتے ہیں جہاں پانی، بجلی، سڑکیں اور تمام ضروریات زندگی موجود ہوتی ہیں۔ ہمارے شہروں میں فلک بوس عمارتیں ہوں گی اور ہر شہر، روشنیوں کا شہر ہوگا۔ ہمارا ملک دنیا میں چین کے بعد دوسرا سب سے بڑا ملک تھا، ہمیں کم از کم برطانیہ اور امریکا کے برابر ترقی یافتہ تو ہونا چاہئے تھا۔ میری خواہش تھی کہ دنیا بھر کے لوگ ہمارے ملک کی طرف رشک کی نظر سے دیکھیں اور سیاحت کیلئے ہمارے ہاں آنے کے خواب دیکھیں۔ ہمارے مزدور کے پاس بھی کار اور ذاتی گھر ہو۔ ذہین اور دانشور لوگ ملک کا نظام چلا رہے ہوں۔

یہ سب درحقیقت میرے خواب تھے جنہیں میں نے پارٹی کے منشور میں سمو دیا تھا۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پڑھے لکھے شیخ چلی کے خواب تھے اور مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میں سیاست میں آ جاؤں تو ان خوابوں کو تعبیریں مل سکتی ہیں۔ دوسرے روز میں نیشنل پارٹی کے دفتر پہنچا تو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوجوان مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ہماری پارٹی کا پروگرام ان تک پہنچ چکا تھا اور وہ پارٹی کیلئے کام کرنے کے سلسلے میں بڑے پُرجوش تھے۔

شہر کی دو ممتاز شخصیات نے پچھلے دنوں شیواجی پارک میں ہمارے جلسے کے دوران ہماری پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آج میں نے اس سلسلے میں ان کا حتمی جواب جاننے کیلئے انہیں پیغام بھیجا تو ان کا جواب آیا کہ انہوں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ یہ پہلا جھٹکا تھا جو اپنے سیاسی سفر کے آغاز کے بعد مجھے لگا۔ پھر مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میں نے پارٹی کا جو منشور بڑی عرق ریزی سے قلمبند کیا تھا، اسے چھپنے کیلئے پریس بھیجنے کے بجائے پارٹی کے کچھ دیگر عہدے دار اس میں ردوبدل میں مصروف تھے۔

انتخابات میں صرف چھ ہفتے باقی تھے۔ اتنے مختصر وقت میں پورے انڈیا میں موزوں امیدوار تلاش کرنا ہی ناممکن تھا۔ اگر ہم امیدوار تلاش کر بھی لیتے اور انہیں تمام حلقوں سے لڑنے کیلئے کھڑا بھی کر دیتے تب بھی یہ بات یقینی نہیں تھی کہ وہ سارے کے سارے جیت جاتے۔ لوک سبھا، یا اسمبلی میں اکثریت حاصل کئے بغیر تو ہم اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کیلئے پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ میرا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا اور بے شمار سوچوں نے مجھے گھیر لیا۔

میں اندر اپنے کمرے میں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ دوسرے کمرے میں نوجوان منتظر بیٹھے تھے کہ ان کی رکنیت کے فارم بھر کر انہیں پارٹی میں شامل کیا جائے۔ مجھے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ ہماری پارٹی میں شامل ہو کر انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ آخر کار میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا اور دل پر پتھر رکھ کر میں نے انہیں بتایا کہ فی الحال الیکشن کیلئے ہماری پارٹی کی تیاریاں مکمل نہیں تھیں، اس لئے انہیں جو بھی دوسرے سیاسی لیڈر اچھے لگتے ہوں، وہ ان کیلئے کام کریں۔ وہ بے چارے اپنے چہروں پر مایوسی لئے رخصت ہو گئے۔ میں ان سے زیادہ مایوس تھا۔ یہ میرے ''سیاسی کیریئر'' کا اختتام تھا۔ میرے ارمانوں کا غنچہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا تھا۔ ملک کی تقدیر بدلنے کا جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ بہت جلد چکنا چور ہو گیا۔

پھر میں نے سوچا کہ اٹل بہاری واجپائی کی حمایت کروں اور ان کیلئے کام کروں۔ میں دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ میں ان کے جلسے میں تقریر کرنے گیا۔ ان انتخابات میں دہلی میں شاید اندرا کانگریس کے مقابلے میں وہ واحد امیدوار تھے جو کامیاب ہوئے۔ ملک بھر میں اندرا کانگریس بھاری اکثریت سے جیت گئی تھی۔ جب اندرا گاندھی اپنی فتح کا جشن منا رہی تھیں تو ان کا بیٹا سنجے جو الیکشن جیت کر دوبارہ پارلیمنٹ کا ممبر بن چکا تھا، اپنا طیارہ خود اڑاتے ہوئے، حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

میں اس وقت ایک فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا جب میرے ایک کارکن نے آ کر مجھے اس حادثے کی خبر دی اور ساتھ ہی میرے کان میں کہا کہ اگر سنجے زندہ رہتا تو شاید میرے خلاف انتقامی کارروائیاں کرتا۔ میں نے ہنس کر یہ کہتے ہوئے بات ٹال دی کہ ضروری نہیں، وہ ایسا کرتا۔ پھر میں نے اندرا گاندھی کو ایک خط بھی لکھ دیا جس میں، میں نے انہیں ان کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دی لیکن ساتھ ہی میں نے ان کے جوان صاحبزادے کی ناگہانی اور حادثاتی موت پر اظہار افسوس بھی کیا۔

☆.....☆.....☆

اپنی فلم ''دیس پردیس'' کی امریکا میں ریلیز کے سلسلے میں مجھے نیویارک جانا پڑا۔ میں اس سے پہلے بھی نیویارک کے نہ جانے کتنے چکر لگا چکا تھا اور مجھے یہ شہر بہت ہی پسند تھا۔ میری اس فلم کی ہیروئن اور میری نئی دریافت ٹینا منیم لندن تک میرے ساتھ آئی تھی۔ لندن میں بھی اس فلم کا پریمیئر شو ہوا تھا۔ ٹینا کو لندن سے ہی ممبئی واپس جانا پڑا اور میں نیویارک آ گیا۔

میرے قیام کے دوران ایک روز بہت سی ایسی لڑکیاں میرے ہوٹل کے کمرے میں مجھ سے آٹوگراف لینے آئیں جن کے والدین طویل عرصے سے امریکا میں مقیم تھے اور جو وہیں پلی بڑھی تھیں۔ وہ سب تیز طرار، اسمارٹ اور چلبلی لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے آٹوگراف لینے کے بعد بلاتمہید کہا ''میں آپ کی کسی فلم میں کام کرنا چاہتی ہوں''۔

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت سنجیدہ اور پُرعزم دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے پوچھا ''تمہاری عمر کیا ہے؟''

''میں جلد ہی چودہ سال کی ہونے والی ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔

''ابھی تم چھوٹی ہو''۔ میں نے کہا ''رابطہ رکھنا..... شاید مستقبل میں میری کسی فلم میں تمہارے لئے گنجائش نکل سکے''۔

اس کی فرمائش پر میں نے اس کی آٹوگراف بک میں اپنا ایڈریس لکھ دیا۔ اس نے اپنا نام ریچا شرما بتایا۔

ایک سال بعد جب میں اپنی فلم ''لوٹ مار'' بنا رہا تھا تو ایک بار پھر مجھے نیویارک آنے کا اتفاق ہوا۔ اس بار میں ایک مقابلہ حسن میں جج کے طور پر مدعو تھا۔ یہ مقابلہ حسن مین ہٹن کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہوا جہاں مجھے بہت سے ایسے بھارتیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو عرصے سے امریکا میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے پاس وہاں کی شہریت تھی اور وہ بے حد متمول تھے۔ وہ اپنے اپنے شعبے میں نہایت نمایاں مقام رکھتے تھے اور ان کا شمار امریکا کے بہت اونچے طبقے میں ہوتا تھا۔ میں ان لوگوں سے مل کر، ان کے بچوں کو دیکھ کر، ان کے طور طریقے اور انداز گفتگو دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان میں سے بعض لوگوں کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ انڈیا میں تھے۔ وہاں وہ کسی خاص حیثیت کے حامل نہیں تھے لیکن دیار غیر میں آ کر انہوں نے بہت ترقی کی تھی۔

انہی لوگوں میں مجھے ایک امریکن لڑکی بھی ملی جو کھدر کا ہندوستانی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے موتیوں اور منکوں کی مالائیں تھیں۔ اس کے ساتھ ایک بھارتی نوجوان تھا جس کا حلیہ سادھوؤں جیسا تھا۔ لڑکی اسے اپنا ''گرو'' مانتی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بعض امریکی، ہم ہندوستانیوں کو ایک ''پراسرار'' سرزمین کے باشندے سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ہم میں سے بعض، بڑی غیر معمولی روحانی طاقتوں کے مالک ہوتے تھے۔ وہ ان کے عقیدت مند بن کر، ان میں ''پراسرار روحانی طاقتیں'' تلاش کرتے رہتے تھے، جو شاید اپنے اعتقاد کی بدولت انہیں نظر بھی آ جاتی تھیں۔

یہ سب دیکھ کر میرے ذہن میں ایک فلم کے خیال نے جنم لے لیا، جس کا نام بھی میں نے اسی دوران سوچ لیا۔ وہ نام تھا ''سوامی دادا''۔ میری اکثر فلموں کے خیال اسی

فروری 1999ء میں دیو آنند بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے ساتھ ''دوستی بس'' کے ذریعے واگہ بارڈر، لاہور پہنچے تو اس وقت کے وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف نے اُن کا استقبال کیا

طرح، کسی چیز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ابھرتے تھے۔ ابتدا میں وہ محض ایک مختصر اور دھندلا سا خاکہ ہوتا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ بہت سی باتیں سوجھتی رہتی تھیں اور فلم کی پوری کہانی کا تانا بانا تیار ہو جاتا تھا۔

میں نے اپنی فلم ''لوٹ مار'' میں بھی ٹینا منیم کو لیا تھا۔ اسے میری کمپنی کے علاوہ دوسرے اداروں کی فلمیں بھی ملنے لگی تھیں اور وہ بے حد مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ، بہت کم عرصے میں ایک منجھی ہوئی فنکارہ بھی بن گئی تھی لیکن پھر اچانک وہ فلموں سے غائب ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے فلموں اور اداکاری کے علاوہ کوئی اور مصروفیت ڈھونڈ لی تھی، پھر ایک روز اچانک مجھے ایک نہایت خوبصورت اور قیمتی قسم کا شادی کارڈ ملا جس سے مجھے پتا چلا کہ اس کی شادی انڈیا کے ایک بہت بڑے بزنس مین، صنعت کار اور سرمایہ دار انیل امبانی سے ہو رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ ''ٹینا منیم'' سے ''ٹینا امبانی'' ہو گئی۔ ٹینا اور انیل کی جوڑی نہایت شاندار تھی اور ان کی شادی بے حد کامیاب رہی۔ وہ دونوں آج بھی میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

''سوامی دادا'' کی کاسٹ مکمل کرنے کے لئے ایک بار پھر مجھے نیویارک جانا پڑا۔ مجھے خاص طور پر ایک امریکی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرا ڈسٹری بیوٹر دوست اس تلاش میں میری مدد کر رہا تھا۔ اس کا نیویارک میں بھی آفس تھا۔ ہم نے ایک بڑے اخبار میں نئے چہرے کی تلاش کے لئے اشتہار دیا۔ اس کے جواب میں جتنی لڑکیاں امیدوار کے طور پر سامنے آئیں، ان کی تعداد دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ان میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں شامل تھیں اور ان سب کی آنکھوں میں اپنے اپنے خواب تھے۔ چھ ہفتے تک امیدوار لڑکیوں کے انٹرویو جاری رہے۔

میری ایک پرانی دوست، جو سابق مس انڈیا بھی تھی، ان دنوں بوسٹن میں رہائش پذیر تھی۔ اس نے ایک روز مجھے ایک رسالے ''بوسٹن گلوب'' کا تازہ شمارہ بھیجا جس کے ٹائٹل پر نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک ہنستی ہوئی نوخیز لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کم عمر لڑکی کی نیلی آنکھیں اور زندگی سے بھرپور ہنسی دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ میری تلاش مکمل ہو گئی ہے۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

میرا بیٹا بھی مجھ جیسا اسٹار بننا چاہتا تھا

قسط : 30

اس لڑکی کا نام لین سوینی تھا اور وہ نسلاً آئرش تھی۔ میں نے اسے نیویارک بلوا کر اپنی نگرانی میں اس کا فوٹو سیشن کروایا اور اسے اپنی فلم ''سوامی دادا'' کیلئے منتخب کرلیا۔ اس کا فلمی نام میں نے کرسٹائن اونیل رکھا۔ وہ فلم کی شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی بمبئی آگئی۔ میں نے اسے جوہو کے ساحلی علاقے میں واقع ''سن اینڈ سینڈ'' ہوٹل میں ٹھہرایا۔ روزانہ شام کو وہ سوئمنگ پول کے قریب ٹہل ٹہل کر، اپنے واک مین اور کانوں پر لگے ہوئے ہیڈ فونز کے ذریعے اردو میں اپنے مکالمے ادا کرنے کی مشق کرتی تو وہاں موجود سب لوگ حیرت اور تجسس سے اس نوخیز، سفید فام لڑکی کو دیکھتے۔

ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ خود کلامی کیوں کررہی ہے؟ میں نے فلم میں اس کے مکالمے اپنی آواز میں، اردو میں ریکارڈ کرکے دے دیئے تھے۔ وہ بڑی محنت سے انہیں یاد کرتی۔ انڈین ملبوسات، لہنگا، ساڑھی وغیرہ پہن کر وہ بہت خوش ہوتی۔ اس کے ساتھ میں نے پدمنی کولہاپوری کو کاسٹ کیا تھا جو ان دنوں نوجوان تھیں اور انہوں نے چند ہی فلموں میں کام کیا تھا۔

''سوامی دادا'' کی شوٹنگ کے دوران مجھے مزید دو مرتبہ نیویارک جانا پڑا۔ ایک مرتبہ تو میں اسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں گیا۔ دوسری مرتبہ اس لئے جانا پڑا کہ وہاں انڈیا کے یوم آزادی کی تقریبات میں مجھے گرینڈ مارشل کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ میرے اس قیام کے دوران ایک روز دوپہر بارہ بجے ہوٹل میں میرے کمرے کے دروازے کی کال بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک دراز قد، اسمارٹ اور دلکش لڑکی کھڑی تھی۔ وہ مردانہ ڈیزائنر سوٹ میں تھی۔ سر پہ فیلٹ ہیٹ بھی تھا۔

''مجھے پہچانا.....؟'' اس نے امریکی لہجے میں انگریزی میں پوچھا اور مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر ذہن پر زور دیتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کون تھی۔ مجھے الجھن میں دیکھ کر وہ خود ہی بول اٹھی۔ ''میں ریچا شرما ہوں..... اور آج ٹھیک بارہ بجے میں اٹھارہ سال کی ہوگئی ہوں۔ امریکی قوانین کے مطابق اب میں اپنی زندگی کے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوں۔''

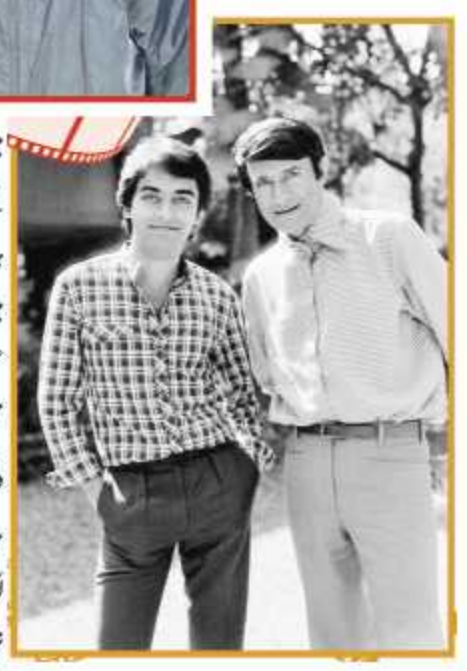

میں واقعی حیران رہ گیا۔ میں اسے تقریباً چار سال بعد دیکھ رہا تھا اور ان چار سالوں میں وہ ایک بھرپور اور نہایت دلکش لڑکی بن گئی تھی۔ اس کے خدوخال کی خوبصورتی مردوں کے دلوں کی دھڑکنیں بے قابو کرسکتی تھی۔

اس ریچا شرما کو میں نے اپنی فلم ''ہم نوجوان'' میں متعارف کرایا اور یوں انڈین فلم انڈسٹری تو ایک اور نئی ہیروئن دی۔

☆.....☆.....☆

میرے بیٹے سنیل نے امریکا کی ایک یونیورسٹی سے بزنس مینجمنٹ کا کورس کیا تھا اور اب وہ واپس آچکا تھا۔ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا اور اسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی لیکن میری خواہش تھی کہ وہ اپنے طور پر بھی کوئی ایسا کام کرے کہ عملی زندگی میں اپنے باپ سے بھی زیادہ کامیاب نظر آئے۔ بزنس مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ اس نے خود کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں نے فلم پروڈکشن کمپنی کی صورت میں اس کے لئے جو کاروبار مستحکم کردیا ہے، وہ اسے سنبھالے اور اس نے جو تعلیم حاصل کی ہے، اس سے استفادہ کرتے ہوئے، بزنس کو اور بھی وسعت دے۔

میں نے اس کے لئے ''نوکیتن'' کمپنی کے دفتر میں ایک علیحدہ اور شاندار کمرا بھی بنوادیا۔ اس نے اپنے کمرے میں بیٹھنا بھی شروع کردیا لیکن کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ اس کے خواب تو کچھ اور ہیں۔ اس نے بزنس مینجمنٹ کی تعلیم ضرور حاصل کی تھی لیکن اسے کاروبار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو درحقیقت اپنے باپ کی طرح ایک اسٹار بننا چاہتا تھا۔ ممکن ہے میری شہرت اور مقبولیت دیکھ کر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو۔

اس نے مجھے بتائے بغیر ایک اسکول میں بھی داخلہ لے لیا جہاں اداکاری سکھائی جاتی تھی۔ پھر ایک روز اس نے اپنے اس شوق کا اظہار کردیا کہ وہ فلم اسٹار بننا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ چلو، اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ میں اسے فلم اسٹار بنانے میں اہم کردار ادا کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے شوق کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ایک دوست کا ذکر کیا جو ایکٹنگ اسکول میں اس کے ساتھ تھا اور اسی کی طرح اداکاری کی تربیت حاصل کررہا تھا۔ سنیل نے بتایا کہ اس کا وہ دوست مجھ سے ملنے کا بہت مشتاق تھا۔ وہ سنیل سے کئی بار فرمائش کرچکا تھا کہ مجھے اپنے والد سے ملواؤ۔ میں نے سنیل سے کہہ دیا کہ وہ کسی روز اپنے دوست کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔

دوسرے روز میں آفس سے گھر آرہا تھا تو مجھے ایک سگنل پر گاڑی روکنا پڑی۔ اس دوران میری نظر ایک بڑے سے ہورڈنگ پر پڑی جس پر ایک سگریٹ کا اشتہار موجود تھا۔ اس اشتہار کا ماڈل ایک ہینڈسم نوجوان تھا جو اتنے شاندار اسٹائل سے دو انگلیوں میں سگریٹ دبائے ہوئے تھا کہ شاید اسے دیکھ کر بہت سے ایسے لوگوں کا بھی سگریٹ پینے کو جی چاہنے لگا ہو، جو سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ اس خوبرو نوجوان کی مسکراہٹ بھی بہت اچھی تھی۔ اس کی شخصیت میری نظروں میں بس گئی۔

سگنل کھلا تو میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ جب میں گھر پہنچا اور گیٹ کھلنے پر گاڑی اندر لے گیا تو گاڑی کی آواز سن کر سنیل اندر سے، باہر برآمدے میں آگیا۔ ایک ہینڈسم نوجوان اس کے ساتھ تھا جس نے گردن میں رومال ڈال کر اسے گرہ لگائی ہوئی تھی۔ اس کا گریبان کھلا تھا۔ میں گاڑی سے اترا تو سنیل اس نوجوان کو ساتھ لے کر میری طرف لپک آیا۔

''پاپا..... اس سے ملئے..... یہ میرا وہ دوست ہے جو آپ سے ملنا چاہتا تھا.....'' سنیل نے خاصے پُرجوش لہجے میں بتایا۔

ہم تینوں لان پر آبیٹھے۔ نوجوان سے تعارف ہوا تو پتا چلا کہ اس کا نام جیکی شیروف تھا۔ وہ بہت سلجھا ہوا اور شائستہ انسان تھا۔ میرے دل نے فوراً مجھے بتایا کہ اس کے اندر ایک اچھا اداکار چھپا ہوا تھا۔ شاید ایک اور دیو آنند.....!

''میں تو تم سے، پہلے ہی مل چکا ہوں.....'' میں نے اس نوجوان سے کہا ''جب میری تم سے ملاقات ہوئی تو تم کوئی اچھا کام نہیں کررہے تھے۔ تم ایک سگنل پر ایک برانڈ کی سگریٹ کی تشہیر کررہے تھے۔''

وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''سر..... کیا کروں..... میں ایک ماڈل ہوں..... بہت سی چیزوں کی ماڈلنگ کرنا پڑتی ہے..... لیکن میرا اصل خواب آپ جیسا اداکار بننا ہے۔''

میں نے اسے ''سوامی دادا'' میں کاسٹ کرنے کے ارادے سے اس کا آڈیشن کرایا۔ میں نے اس کا آڈیشن دیکھنے کے بعد اسے کاسٹ کرنے کا، دل ہی دل میں حتمی فیصلہ کرلیا تھا لیکن اسی دوران متھن چکرورتی بیچ میں کود پڑے۔ وہ ہر قیمت پر اس فلم میں رتی اگنی ہوتری کے مقابل مرکزی کردار کرنا چاہتے تھے۔ میں بھی تھوڑا سا لالچ میں آگیا۔ جیکی شیروف بالکل نئے تھے۔ متھن چکرورتی کا فلمی مارکیٹ میں پھر بھی کچھ نام تھا۔ انہیں کاسٹ کرنے کی صورت میں فلم کی کامیابی کے امکانات اور اس کی مارکیٹ ویلیو بڑھنے کی امید تھی۔ چنانچہ میں نے جیکی شیروف کو چھوڑ کر متھن چکرورتی کو کاسٹ کرلیا۔

پھر مجھے پتا چلا کہ جیکی شیروف کو تو فلم میں ہیرو بننے کا شوق بھی نہیں تھا۔ وہ تو ولن بننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ خواہ ان کا رول مختصر ہی کیوں نہ ہو..... چنانچہ ہوا یہ کہ آخرکار میں نے جیکی کو شکتی کپور کے ساتھی کے کردار میں کاسٹ کرلیا۔ پوری فلم کے دوران وہ شکتی کپور کے ساتھ ہی، زیادہ تر خاموش کھڑے نظر آئے۔ ان کے ہونٹوں میں سگریٹ جھول رہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ دلکش انداز میں سگریٹ کا کش لیتے دکھائی دیتے۔

یہ کردار بلاشبہ کچھ زیادہ اہم نہیں تھا لیکن جیکی شیروف فلمی شائقین..... خصوصاً خواتین کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ کامیاب فلمساز اور ہدایت کار سبھاش گھئی کی نظر میں بھی آگئے جنہوں اپنی آئندہ فلم میں انہیں ہیرو کے طور پر کاسٹ کرلیا جس کے بعد وہ راتوں رات دیو آنند ہی کی طرح ایک اسٹار بن گئے۔

ادھر اپنے بیٹے سنیل کو فلموں میں متعارف کرانے کے لئے میں نے ''آنند اور آنند'' بنائی۔ یہ ایک باپ بیٹے کی کہانی تھی جس میں سنیل کے باپ کا کردار اس کے حقیقی باپ..... یعنی میں نے خود ادا کیا۔ سنیل نے فلم میں ایکشن سین اس سے بھی زیادہ اچھے کئے جیسے میں جوانی میں کرتا تھا۔ حقیقی زندگی میں بھی سنیل کو ایکشن بہت پسند تھا اور وہ ہانگ کانگ سے جوڈو کراٹے سیکھ کر آیا تھا۔ ڈانس اور رومانی مناظر پکچرائز کرانے میں بھی وہ مجھ سے بہتر تھا..... لیکن شاید یہ ایک باپ کی نظر تھی۔ فلمی شائقین اسے کسی اور زاویہ نظر سے دیکھ رہے تھے۔

''آنند اور آنند'' میں سنیل کو دیکھ کر ایک اور ڈائریکٹر نے بھی اسے سائن کیا۔ ہمارے اپنے ادارے ''نوکیتن'' میں بھی اس کے لئے ایک اور فلم کا منصوبہ بنایا گیا جس میں، میں نے ریکھا اور سمیتا پاٹیل کو بھی کاسٹ کیا۔ دونوں ہی غضب کی اداکارائیں تھیں۔ میں جب بھی ان میں سے کسی کو اپنی کسی فلم میں کاسٹ کرنے جاتا تھا تو وہ نہ تو یہ پوچھتی تھیں کہ معاوضہ کیا ملے گا، اور نہ ہی انہیں اس سے غرض ہوتی تھی کہ کردار کیا ہوگا..... وہ بس خاموشی سے فلم سائن کردیتی تھیں۔

فلم میں تیسرا زبردست اداکار راج ببر تھا۔ ان تینوں کو میں نے اس خیال سے کاسٹ کیا تھا کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے سنیل کو سہارا ملے گا لیکن شاید سنیل بہترین فنکاروں کے بیچ میں دب کر رہ گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ اس کا موازنہ اس کے باپ سے کرتے ہوں، حالانکہ میرا دور گزر چکا تھا۔ وہ نئے زمانے کا اداکار تھا۔ میرا خیال تھا کہ لوگ اس کا موازنہ مجھ سے نہیں کریں گے..... اور اگر کریں گے تو شاید اسے مجھ سے بہتر پائیں گے..... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید میرے یہ سبھی اندازے غلط ہیں۔ درحقیقت اسی کا نام تقدیر ہے۔ قدرت نے ہر ایک کے لئے کوئی راستہ مقرر کررکھا ہے۔ جب تک وہ اس راستے پر نہیں پہنچتا، تب تک شاید بے مقصد ہی اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ بہرحال..... جس وقت میں یہ سطور قلمبند کررہا ہوں، اس وقت تک سنیل، اسٹار نہیں بن سکا ہے..... (جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیو آنند کی داستانِ حیات

دلفریب خوشبو نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا

تمکین تبسم

قسط : 31

ریچا شرما کو میں نے اپنی فلم ''ہم نوجوان'' میں ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا تھا۔ فلم ختم ہوتے ہی اس کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی جو اس کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ یہ نوجوان سنجے دت تھا۔ میں جب سنجے دت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ننھا سا وہ خوبصورت بچہ یاد آتا ہے جو اپنے والد کو چھوڑ کر میری گود میں آ بیٹھتا تھا۔ مجھے اس کی شکل میں اس کے باپ سنیل دت سے زیادہ اس کی ماں نرگس کی شباہت محسوس ہوتی تھی۔

تبو نے ''ہم نوجوان'' میں میری نوخیز بیٹی کا رول کیا تھا جو نوعمری میں ہی زیادتی کا شکار ہو جاتی ہے۔ تبو نے اس فلم میں بڑے ذوق و شوق سے کام کیا تھا۔ یہ اس کی پہلی فلم تھی اور اس کم عمری میں ہی اس کی اداکارانہ صلاحیتیں واضح نظر آ گئی تھیں لیکن اپنے اوپر مجرمانہ حملے کا سین پکچرائز کراتے وقت وہ سخت خوفزدہ تھی۔ ایک بار تو وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔

فلم آخری مراحل میں تھی اور میں ایک روز سیٹ پر شوٹنگ کر رہا تھا جب کسی نے آ کر مجھے خبر سنائی کہ وزیراعظم اندرا گاندھی کو ان کے دو سکھ محافظوں نے گولیاں مار کر قتل کر دیا ہے۔ پورے ملک کو اس خبر نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ میرے جسم سے بھی گویا جان سی نکل گئی اور دل بوجھل ہو گیا۔ میں ایک طرف گوشہ تنہائی میں جا بیٹھا۔ میرے تصور میں یادوں کی فلم سی چلنے لگی۔ گو کہ اندرا گاندھی نے جب ایمرجنسی نافذ کی تو میرے اور ان کے درمیان کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی لیکن ایمرجنسی سے پہلے اور بعد میں میری ان سے کئی خوشگوار ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

کون سوچ سکتا تھا کہ ایک روز ان کے اپنے محافظ ہی انہیں قتل کر دیں گے۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف جو ایکشن لیا تھا، اس نے سکھ قوم کو ان سے ناراض کر دیا تھا۔ ان کے قتل کی خبر سن کر میرا ذہن نہ جانے کہاں سے کہاں بھٹک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جو لوگ قوم کے رہنما ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں اتنے زیادہ محافظوں کی ضرورت کیوں رہتی ہے؟ کیا ستم ظریفی تھی کہ قوم کی رہنما، ملک کی سربراہ اور خاتون آہن کہلانے والی کو اس کے اپنے محافظوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

اگلے چند دنوں کے دوران سرکاری ٹی وی پر اندرا گاندھی کی چتا نذرِ آتش کئے جانے کے مناظر بار بار دکھائے گئے۔ ان مناظر میں ان کے صاحبزادے راجیو گاندھی، سفید کرتے پاجامے میں، چتا کے قریب سوگوار کھڑے نظر آئے۔ عوام کی ہمدردیاں خود بہ خود ہی ان کے ساتھ ہوتی چلی گئیں۔ وہ اندرا گاندھی کے جانشین ثابت ہوئے اور ایک روز ملک کے وزیراعظم بن گئے۔

ابتداء میں وہ کچھ ہچکچاہٹ کا شکار نظر آئے لیکن رفتہ رفتہ ان میں اعتماد آ گیا۔ وہ پڑھے لکھے، ماڈرن اور کشادہ ذہن کے آدمی تھے۔ انہوں نے ملک کا نظام بہت اچھی طرح چلایا اور بہت سی اصلاحات کیں۔ بعض لوگ میری فلموں کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ اپنے وقت سے آگے کی ہوتی ہیں۔ شاید ان کا خیال درست ہی ہو۔ میں نے اپنی فلم ''اوّل نمبر'' میں ایک اسٹیڈیم کا سین دکھایا تھا۔ اس اسٹیڈیم میں ملک کے وزیراعظم بھی فائنل میچ دیکھنے کے لئے آئے تھے لیکن وہ پورا میچ دیکھنے سے پہلے ہی وہاں سے اپنے محافظوں کے حصار میں رخصت ہو جاتے ہیں۔

دراصل، سیکیورٹی کے ذمے دار، خفیہ اداروں نے اطلاع دی تھی کہ تامل ٹائیگرز اسٹیڈیم میں بم دھماکا کر کے وزیراعظم کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح میں نے فلم کے ذریعے دہشت گردی کے مسئلے کو اسپورٹس کے ساتھ ملا کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ سنسر بورڈ نے اعتراض کر دیا کہ میں فلم میں تامل ٹائیگرز کا نام نہ لوں۔ یہ حساس مسئلہ تھا۔ چنانچہ ہمیں فلم میں تامل ٹائیگرز کی جگہ دہشت گرد تنظیم کا فرضی نام استعمال کرنا پڑا۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد راجیو گاندھی کو تامل ٹائیگرز نے خودکش بم دھماکے کے ذریعے سفاکانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی اطالوی بیوہ سونیا گاندھی روتی بلکتی رہ گئیں۔ ان کے ساتھ پوری قوم رو رہی تھی۔ اس المناک واقعے پر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اندرا گاندھی نے راجیو اور سونیا کی شادی کا دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا تھا لیکن میں اس وقت کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ اب مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش میں نے سونیا کے بیوہ ہونے کا منظر دیکھنے کے بجائے انہیں راجیو سے شادی کے بندھن میں بندھتے ہوئے دیکھا ہوتا۔

.....☆.....

ایک روز میں اپنی گاڑی میں اسٹوڈیو سے واپس آیا اور گھر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو میں نے اپنی بیٹی دیوینا کو ایک لڑکے کے ساتھ وہاں کھڑے دیکھا۔ وہ دونوں رازدارانہ انداز میں کوئی بات کر رہے تھے۔ دیوینا نے ابتدائی تعلیم ڈیرہ دون اور مسوری کے اسکولوں میں حاصل کی تھی۔ اس کے بعد اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ میں خود اسے ساتھ لے کر سوئٹزرلینڈ گیا اور ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا کے آیا۔

کچھ عرصے بعد اس کا وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے فرمائش کی کہ وہ لندن کے ایک ادارے سے فوٹوگرافی کی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ادارہ اس سلسلے میں بہت مشہور اور مستند تھا۔ دیوینا کا کہنا تھا کہ وہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ فوٹوگرافی کی مزید اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے بوسٹن جائے گی۔ وہ تفتیشی فوٹو جرنلسٹ بننا چاہتی تھی اور ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' جیسے مشہور زمانہ رسالوں کے لئے فوٹوگرافی کرنا چاہتی تھی۔

میں نے بہ خوشی اسے لندن کے ادارے میں داخلہ دلوا دیا۔ میری خواہش تھی کہ میرے بچے اپنی خواہش کے مطابق اپنا مستقبل بنائیں، وہ کام کریں جو وہ خوشی سے کر سکتے ہوں اور جس میں ان کا دل لگتا ہو۔ میں ان پر اپنی مرضی کی کوئی چیز مسلط کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دیوینا نے لندن میں تو فوٹوگرافی کی تعلیم مکمل کر لی لیکن مزید اور اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ بوسٹن نہیں گئی۔

لندن میں قیام کے دوران ہی اس نے ایک لڑکے کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکا انڈین ہی تھا اور بچپن میں، اسکول میں اس کے ساتھ پڑھ چکا تھا۔ سنیل کو اس بات کا علم ہو گیا کہ دیوینا اور کسی لڑکے میں رسم و راہ بڑھ رہی ہے۔ سنیل نے مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ میں ذرا آزاد خیال قسم کا باپ ہوں۔ ہر باپ کی طرح مجھے اپنے بچوں سے بہت محبت بھی تھی اور یہ اعتماد بھی تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے مجھے شرمسار ہونا پڑے۔ زندگی کا ساتھی منتخب کرنے کے سلسلے میں بھی انہیں میری طرف سے آزادی تھی۔

میں جب گاڑی سے اترا تو ''ہیلو ہائے'' کے بعد دیوینا نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پاپا..... یہ میرے دوست ہیں.....''

میں نے سر ہلایا اور لڑکے کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ شائستہ مزاج اور اچھے خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں مجھے ''ہیلو سر!'' کہا۔

میں منتظر رہا کہ وہ دونوں مزید کچھ بولیں۔ ایک لمحے کے لئے ہمارے درمیان عجیب سی خاموشی حائل ہو گئی۔ آخر دیوینا نے ہی یہ سکوت توڑا۔ ''پاپا! ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

مجھے یک لخت یوں لگا جیسے میں کافی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں کو یقین ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکو گے؟''

دونوں نے تقریباً ایک ساتھ اس کا جواب اثبات میں دیا۔

''ٹھیک ہے..... تو پھر میں تم دونوں کے درمیان دیوار نہیں بنوں گا۔'' میں نے کہا۔ تاہم میرے سینے پر یکایک ایک نادیدہ سا بوجھ آن پڑا تھا جسے برداشت کرنا مجھے بہت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

دیوینا کی شادی بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے ہوئی۔ رخصتی کے وقت وہ میرے گلے لگ کر خوب روئی اور اس کے جانے کے بعد میں بھی بہت دیر تک روتا رہا۔ شادی کے ایک سال بعد اس کے ہاں بچی ہوئی۔ میں اسے دیکھنے اسپتال گیا تو وہ بہت خوش تھی۔ میں بھی اسے خوش دیکھ کر اور اپنی نوزائیدہ نواسی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دونوں کو دعائیں دیتا ہوا گھر آ گیا۔

دیوینا کی ازدواجی زندگی چند سال ہی قائم رہ سکی۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی کے راستے جدا ہو گئے۔ دیوینا گھر واپس آ گئی اور ایک بار پھر میرے گلے لگ کر بہت روئی۔ میں بھی بہت رویا۔ بیٹیاں عموماً خوشی کے موقع پر بھی روتی ہیں اور دکھ کے موقع پر بھی..... اور ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر والدین کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔ میرے لئے جس حد تک ممکن ہو سکا، میں نے دیوینا کو تسلی دی۔ اس کی کمسن بیٹی، جس کا نام ہم نے ''جینا'' رکھا تھا، قریب ہی کھڑی اپنی معصوم آنکھوں میں حیرت لئے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی والدہ اور نانا ایک دوسرے کے گلے لگ کر کیوں رو رہے ہیں۔ میری بیوی مونا بھی ہم سے ذرا دور، کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ کبھی خوشی، کبھی غم۔

دیو آنند، عامر خان اور کرن راؤ کے ساتھ

.....☆.....

''ہم نوجوان'' میں تبو نے ایک نوجوان لڑکی کا ثانوی کردار کیا تھا لیکن فلم تکمیل کے قریب پہنچی تو وہ ہیروئن بننے کے لئے بے تاب ہو چکی تھی۔ ایک روز شوٹنگ کے بعد میں اپنی گاڑی میں اسے اس کے گھر ڈراپ کرنے گیا تو وہ بولی۔ ''کیا میں آپ کی آئندہ فلم کی ہیروئن نہیں ہو سکتی؟''

''تم یقیناً ایک خوبصورت لڑکی ہو..... اور تیزی سے بڑی بھی ہو رہی ہو۔ صرف ایک سال اور ٹھہر جاؤ۔ تم نہ صرف ہیروئن بن جاؤ گی بلکہ ہر طرف تمہارے چرچے بھی ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے ہیروئن کے طور پر متعارف کراتا، کسی اور نے یہ کام کر ڈالا۔ بہت جلد تبو کو نہایت باصلاحیت اداکارہ تسلیم کر لیا گیا۔ میرا یہ فخر بہرحال برقرار رہا کہ اسے فلمی دنیا میں متعارف کرانے والا میں تھا۔ ایک بار میں نیویارک جانے کے لئے جہاز میں بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ برابر کی سیٹ پر نسوانی لباس کی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی ایک مسحور کن خوشبو آئی۔ میں گردن موڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

وہ تبو تھی جو میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ رہی تھی۔ وہ کل تک مجھے بچی لگتی تھی لیکن اب وہ ایک بھرپور اور دلکش لڑکی کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ ہم گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے۔ اتفاق سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے برابر سیٹ ملی تھی اور ہماری منزل بھی ایک تھی۔ میں ایک تقریب میں ایوارڈ لینے جا رہا تھا اور تبو، ایوارڈز کی اس تقریب میں پرفارم کرنے جا رہی تھی۔ وہ اب بہت سمجھدار ہو چکی تھی۔ اس کی باتوں میں پختگی آ چکی تھی۔ زندگی نے بہت تھوڑے عرصے میں اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

''ایوارڈ کی تقریب کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد نیویارک میں آپ سے کہیں ملاقات ہونی چاہئے۔'' وہ مہربان لہجے میں بولی۔ ''ویسے میں تقریب کے فوراً بعد شکاگو جاؤں گی۔''

''تم مجھے اپنے ساتھ شکاگو لے چلنا۔'' میں نے کہا۔

''ضرور..... ضرور.....'' وہ ہنس کر بولی۔ ''آپ مجھے فون کیجئے گا۔ پھر ہم اکٹھے نیویارک سے شکاگو جانے کا پروگرام بنائیں گے۔''

''ٹھیک ہے..... میں تمہیں فون کروں گا۔ میں نے وعدہ کیا..... لیکن نہ میں نے اسے فون کیا اور نہ ہی وہ مجھے اپنے ساتھ شکاگو لے کر گئی۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

اُس کے لہجے میں محبت کا خمار بڑھ گیا تھا

تمکین تبسم

قسط : 32

میں ابھی نیویارک میں ہی تھا کہ ایک روز ہوٹل کے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، وہ محبت کے خمار میں ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے پتا چلا کہ آپ اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں.....'' نسوانی آواز نے کہا۔

''میں نے سوچا، فون کر کے دیکھتی ہوں۔ آپ نے پہچانا، میں کون بول رہی ہوں؟''

''اس جانی پہچانی آواز کو میں کیسے بھول سکتا ہوں؟'' میں نے بھی اپنی آواز میں محبت کا رس گھولنے کی کوشش کی۔

''میں آپ سے ملنے آ سکتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں محبت کا خمار بڑھ گیا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے بلا تامل جواب دیا۔

چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو تجسس اور اشتیاق سے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں وہی پہلی سی..... بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ خوبصورتی اور دلکشی تھی۔

میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ''تم تو پہلے سے بھی زیادہ حسین..... اور تمہاری مسکراہٹ پہلے سے بھی زیادہ دلکش دکھائی دے رہی ہے۔''

''تو پھر مجھے ایک پھول پیش کیجئے۔'' اس نے فرمائش کی۔

میں نے کمرے میں رکھے ہوئے گلدان میں سے، سب سے خوبصورت پھول نکال کر اسے پیش کیا اور کہا۔ ''تم تو سر سے پاؤں تک محبت کے نشے میں ڈوبی دکھائی دے رہی ہو۔''

''ہاں..... آپ کا اندازہ ٹھیک ہے دیو صاحب.....!'' وہ کچھ اور مخمور لہجے میں بولی۔ ''میں واقعی سر سے پاؤں تک محبت کے نشے میں ڈوبی ہوئی ہوں..... کیونکہ میری شادی ہو گئی ہے۔''

میرے جذبات جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ کچھ دیر پہلے میں نے فون پر جب محبت کے خمار میں ڈوبی ہوئی آواز سنی تھی تو میرا خیال تھا کہ محبت کا وہ خمار شاید میرے لئے ہے لیکن بہت جلد میری خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے میرے حلق سے آواز نکلی اور میں نے پوچھا۔ ''کب ہوئی تمہاری شادی؟''

''آج صبح۔'' اس نے گویا ہواؤں کے دوش پر جھولا جھولتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت بہت مبارک ہو مینا کشی ششادری!'' میں نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ دوسروں کو حیران کرنا ہمیشہ سے مینا کشی ششادری کی عادت تھی۔ وہ اپنے عروج کے دور میں، کچھ عرصہ قبل فلم انڈسٹری چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی..... اور آج اس نے نیویارک کے اس ہوٹل میں مجھے خبر سنائی تھی کہ صبح اس کی شادی ہو گئی ہے۔

اس نے مبارکباد کے جواب میں میرا شکریہ ادا کیا تو میں نے پوچھا۔ ''کون ہے تمہارا شوہر؟''

''انڈین ہے..... ڈاکٹر ہے اور امریکا میں رہتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میری دعا ہے کہ تم دونوں بہت اچھی اور مسرت بھری زندگی گزارو۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ وہ مسرت اور شادی سے تقریباً رقص کرنے کے انداز میں لہرائی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی کمرے سے رخصت ہو گئی۔

مینا کشی ششادری ایک نہایت عمدہ رقاصہ تھی۔ میں نے پہلی بار اسے ''سچے کا بول بالا'' میں جیکی شروف کے مقابل کاسٹ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک روز میں ''سن اینڈ سینڈ'' ہوٹل کے ایک سوئٹ میں قائم کئے ہوئے اپنے دفتر میں بیٹھا ٹی وی پر ایک دلچسپ ون ڈے کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا کہ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں لپکا۔ کیوں نہ کرکٹ کے موضوع پر ایک فلم بنائی جائے؟ جب بھی اس طرح کسی فلم کا خیال میرے ذہن میں آتا تھا تو پھر میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس نئے آئیڈیا پر غور کرتے کرتے میں نے فلم کا نام بھی سوچ لیا..... اور وہ نام تھا..... ''اوّل نمبر''

اس فلم کی کہانی ایک، تیزی سے اُبھرتے ہوئے کرکٹ اسٹار اور ایک ریٹائرمنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کرکٹ اسٹار کے گرد گھومتی تھی۔ کہانی میں ایک ریٹائرڈ کرکٹ اسٹار بھی تھا جو کرکٹ بورڈ کا چیئرمین بن چکا تھا۔ یہ رول میں نے خود اپنے لئے رکھا تھا۔ میں اس سے پہلے اپنی ایک فلم ''لو میرج'' میں بھی کرکٹر کا رول کر چکا تھا لیکن وہ فلم کرکٹ کے موضوع پر نہیں تھی۔ ''اوّل نمبر'' میں مکمل طور پر کرکٹ کے موضوع پر بنانا چاہتا تھا اور اسی خیال کے تحت اسکرپٹ لکھ رہا تھا۔

ریٹائرمنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کرکٹ اسٹار کے کردار کے لئے جب میں نے کسی اداکار کی تلاش میں اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ یہ کردار کسی اداکار کے بجائے کرکٹ کے حقیقی کھلاڑی سے کرایا جائے۔ تصور ہی تصور میں میری نظر فوراً پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان عمران خان پر جا کر ٹھہر گئی جنہوں نے حال ہی میں کرکٹ سے اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا تھا۔ وہ نہایت وجیہہ اور فوٹوجینک بھی تھے اور دنیا میں ان کا بڑا نام بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے سوچے ہوئے کردار کو عمران خان ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو فلم کی اہمیت اور انفرادیت بڑھ جائے گی۔ وہ اس کردار میں اس طرح فٹ تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ وہ اپنے ابتدائی ٹیسٹ میچوں میں سے ایک کے لئے بمبئی آئے تھے تو میری ان سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔

وہ ان دنوں لندن میں تھے۔ میں نے کسی سے مشورہ کئے بغیر انہیں لندن فون کر ڈالا۔ انہوں نے کافی خوش خلقی سے بات کی اور رسمی باتوں کے بعد پوچھا۔ ''میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں مسٹر دیو آنند؟''

''میں نے سنا ہے کہ آپ کرکٹ سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور ان دنوں ماڈلنگ کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔ عمران نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے کہا۔ ''آپ ماڈلنگ سے ایک قدم آگے بڑھیں تو ایک اور شعبے کے بھی سپر اسٹار بن سکتے ہیں.....'' میں نے انہیں اپنی آئندہ فلم اور اس کردار کے بارے میں بتایا جو میں نے ان کے لئے سوچ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لئے دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔

''کیا آپ لائن پر ہیں؟'' آخر میں نے پوچھا۔

''بالکل ہوں.....'' وہ بولے۔ ''مجھے آپ کی تجویز اچھی تو لگی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں ذرا بھی اچھا اداکار نہیں ہوں۔''

''اس کی فکر نہ کریں.....'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''اگر میں ذاتی طور پر آپ سے ملاقات کر لوں تو آپ کو فیصلہ کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ میں آپ کو قائل کر لوں گا۔''

''آپ کب لندن آ سکتے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''آپ سے بات کرنے کے بعد لندن کے لئے جو بھی پہلی فلائٹ میسر ہو گی، میں اس سے آ جاؤں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ عمران خان میری اس مستعدی پر حیران رہ گئے۔

انہوں نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی تو میں واقعی پہلی فلائٹ سے لندن پہنچ گیا اور ویسٹ اینڈ کے علاقے میں پورٹ مین ہوٹل میں ٹھہرا۔ وہاں سے میں نے عمران خان کو فون کیا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ ڈنر کی دعوت دی لیکن انہوں نے کچھ سوچ کر کہا کہ میں سوہو کے علاقے میں واقع ان کے اپارٹمنٹ پر آ جاؤں۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وقت طے ہو گیا تو میں ٹیکسی کر کے ان کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ عمران کے بھائی نے گھر کے باہر ہی میرا استقبال کیا۔ وہ خالص پٹھانوں والے اسٹائل کی شلوار قمیض میں تھے۔ میں ان کے ساتھ اندر پہنچا تو عمران خان بڑی گرمجوشی سے ملے۔

میں نے فلم کی کہانی انہیں سنائی اور یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ان کا کردار کتنا اہم تھا لیکن وہ کیمرے کا سامنا کرنے کے تصور سے کچھ گھبرا رہے تھے۔ میں نے ان کا اشتیاق بڑھانے کے لئے یہ بھی کہا۔ ''اگر آپ نے اس فلم میں کام کیا تو میں اس کا پریمیئر شو پاکستان میں رکھوں گا۔ بہت لطف رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ فلموں میں آپ کا وہی مقام بن جائے گا جو ہمارے ہاں امیتابھ بچن کا ہے۔''

''ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ صدر ضیاء الحق نے مجھے وزیر ثقافت کے طور پر اپنی کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دے رکھی ہے۔'' عمران بولے۔

''کوئی حرج نہیں.....'' میں نے فوراً کہا۔ ''آپ وزیر ثقافت ہوتے ہوئے بھی فلم میں کام کر سکتے ہیں۔''

وہ تذبذب کا شکار رہے۔ ان کا رجحان سیاست کی طرف دکھائی دے رہا تھا اور شاید وہ اسے باقی سب چیزوں پر ترجیح دے رہے تھے۔

''میں اسکرپٹ کی ایک کاپی آپ کے پاس چھوڑ جاتا ہوں۔ آپ اسے پڑھیں۔ شاید آپ اپنا رول پڑھنے کے بعد اس میں دلچسپی محسوس کریں۔'' میں نے کہا اور وہاں سے رخصت ہو لیا۔

دوسرے روز شام کو مجھے ہوٹل میں ایک پیکٹ موصول ہوا۔ میں نے کھولا تو وہ ''اوّل نمبر'' کا اسکرپٹ تھا۔ اس کے ساتھ عمران خان کا مختصر سا خط تھا جس میں انہوں نے اس فلم میں کام کرنے سے معذرت کی تھی۔ یہ رول بعد میں ادیتا پنچولی نے کیا۔ عامر خان اس فلم میں ہیرو تھے۔ بعد میں ان کی فلم ''لگان'' جو آسکر کے لئے نامزد ہوئی تھی، اس میں بھی ''اوّل نمبر'' کی کچھ جھلک نظر آئی۔

عامر خان نے جب ''اوّل نمبر'' میں کام کیا، اس وقت وہ فلمی دنیا میں نئے اور تازہ دم تھے۔ ان کے مقابل میں نے آرتی کو ہیروئن کاسٹ کیا تھا اور اس کا فلمی نام ایکتا رکھا تھا۔ اس نے جلد ہی ایک وجیہہ اداکار منیش بہل سے شادی کر لی تھی جو اپنے وقت کی نہایت دلکش ہیروئن نوتن کا بیٹا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بھی ایک فلم میں کام کیا تھا جو میرے بھائی گولڈی نے ڈائریکٹ کی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اسے سیٹ پر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جھانک کر مجھے اپنی فلم ''پے انگ گیسٹ'' کا گانا ''نگاہیں مستانہ.....'' یاد آ گیا جو مجھ پر اور اس کی والدہ پر پکچرائز ہوا تھا۔ یہ وقت کا سفر تھا۔ کل میں اس کی ماں کے ساتھ ہیرو تھا، آج بیٹے کے ساتھ کیریکٹر رول کر رہا تھا۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ بعض لوگ کہتے ہیں، میری فلمیں اپنے زمانے سے آگے کی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی فلم ''اوّل نمبر'' کے ایک منظر میں دکھایا تھا۔ ملک کے وزیراعظم بھی اسٹیڈیم میں فائنل میچ دیکھنے آتے ہیں لیکن میچ ختم ہونے سے پہلے ہی ان کا سیکورٹی کا عملہ عجلت میں انہیں وہاں سے لے جاتا ہے کیونکہ خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے اطلاع آئی تھی کہ شاید انہیں خودکش بم دھماکے کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

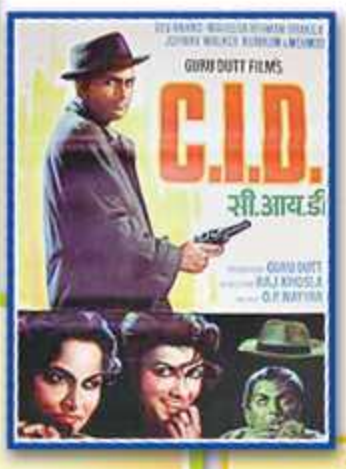

تمکین تبسم

کاش میں بادشاہ ہوتا اور ان سب حسین عورتوں سے شادی کر سکتا!

قسط : 33

یہ محض ایک فلمی سین تھا لیکن کچھ عرصے بعد حقیقت میں راجیو گاندھی کو ایک خودکش بم دھماکے کے ذریعے قتل کر دیا گیا۔ آج کل خودکش یا ریموٹ کنٹرول بم دھماکے دہشت گردی کا سب سے بڑا ہتھیار بن چکے ہیں جن کے پیچھے مختلف قسم کے جنون اور خودساختہ نظریے کارفرما ہوتے ہیں۔ راجیو گاندھی کے سفاکانہ قتل پر میرا دل رو دیا۔ پہلے ماں کو سفاکی سے قتل کیا گیا، پھر اسی سے ملتے جلتے مجنونانہ انداز میں بیٹے کی بھی جان لے لی گئی۔ دونوں المناک واقعات میں گو کہ محرک مختلف تھے لیکن جنون ملتا جلتا تھا۔

راجیو گاندھی ہمیشہ الیکشن اتر پردیش کے شہر امیٹھی سے لڑتے تھے جو گاندھی فیملی کے لئے ایک محفوظ حلقہ تھا۔ یہاں سے صرف ایک بار کسی راجہ کے خاندان کے ایک فرد نے سنجے گاندھی کو ہرایا تھا۔ اس شخص پر بعد میں بیڈمنٹن کے ایک مشہور کھلاڑی کے قتل کا الزام آ گیا تھا۔ اس معاملے سے چھٹکارا پانے کے بعد اس شخص نے اسی کھلاڑی کی بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ انہی سب واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے اپنے ذہن میں ایک فلمی کہانی کا تانا بانا تیار کیا جس میں سیاست کی ہیرا پھیریوں کے ساتھ، قتل کا ایک معما بھی شامل تھا جس سے فلم میں خاصی سنسنی خیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے اس فلم کا نام ''سوکروڑ'' رکھا.....

اپنی اس نئی زیرغور فلم ''سوکروڑ'' کی تیاریوں کے سلسلے میں مجھے ایک بار پھر سوئٹزرلینڈ جانا پڑا۔ اس سے پہلے میں فلم ''پریم پجاری'' کے سلسلے میں سوئٹزرلینڈ گیا تھا۔ اپنے تازہ سفر کے دوران مجھے ایک تقریب میں مہمان خصوصی بننے کیلئے نیویارک بھی جانا پڑا۔ نیویارک جاتے وقت جہاز میں سفر کے دوران مجھے انانیہ کا خیال آیا۔ وہ ایک نوجوان گلوکارہ تھی اور اپنے والدین وغیرہ کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے اسے اسٹیج پر گاتے سنا تھا۔ اس کی آواز اور شکل صورت، دونوں ہی اچھی تھیں۔

میں نے نیویارک پہنچ کر اپنے ہوٹل سے اسے فون کیا تو اس کے والد نے فون اٹھایا۔ مجھے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ انانیہ سمیت سب گھر والوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ''دیو آنند صاحب'' نے ان کے ہاں فون کیا ہے۔ انانیہ اسی شام خوشی خوشی مجھ سے ملنے ہوٹل آ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے ذہن میں اس کے لیے ایک فرانسیسی نژاد انڈین لڑکی کا رول تھا جو سوئٹزرلینڈ میں رہتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا خواب تو ایک بڑی گلوکارہ بننے کا تھا لیکن وہ یہ رول کرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرے گی۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ میں فلم میں اس کا ایک گانا رکھوں گا جو اس کی آواز میں ہوگا اور اسی پر پکچرائز ہوگا۔ اس بات پر وہ اور بھی زیادہ خوش ہو گئی۔ وہ فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں میرے ساتھ اکیلی سوئٹزرلینڈ بھی گئی۔

انانیہ فلموں کے لیے بطور اداکارہ یا گلوکارہ زیادہ عرصے کام نہیں کر سکی۔ ''سوکروڑ'' میں کام کرنے سے پہلے اس کے دو البم ریلیز ہو چکے تھے۔ وہ ''مس نیویارک'' اور ''مس نیوجرسی'' بھی منتخب ہو چکی تھی۔ اس کی کسی نوجوان سے دوستی تھی۔ ''سوکروڑ'' میں اپنا کام مکمل کراتے ہی اس نے اپنے بوائے فرینڈ سے شادی کر لی۔

انانیہ کے ساتھ میں نے ایک مسلمان لڑکی فاطمہ شیخ کو دوسری ہیروئن کے طور پر کاسٹ کر لیا تھا۔ اس کا نام فلم کی کاسٹ میں شامل دیکھ کر شیوسینا کے سربراہ بال ٹھاکرے کے دل میں ابال آ گیا۔ ان کی اور ان کی جماعت کی پالیسی چونکہ اسلام دشمنی اور ہر شعبے میں مسلمانوں کے بائیکاٹ کی کوششوں پر مبنی تھی، اس لیے انہیں فلم کی کاسٹ میں ایک مسلمان لڑکی کا نام شامل دیکھ کر اپنی متعصبانہ سیاست چمکانے کا موقع مل گیا۔

انہوں نے خود ہی یہ بھی فرض کر لیا کہ وہ لڑکی پاکستانی ہوگی۔ مہاراشٹر میں عملی طور پر بال ٹھاکرے ہی پس منظر میں رہ کر حکومت چلا رہے تھے۔ بظاہر وہاں ان کی جماعت شیوسینا کی حکومت نہیں تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ صوبے میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے ایک چھوٹے علاقے کے ڈسٹری بیوٹر نے فون کیا کہ شیوسینا کے مسلح غنڈوں نے وہاں کے سینماؤں میں میری فلم ''سوکروڑ'' کی نمائش رکوا دی تھی۔

میں فوراً بال ٹھاکرے کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ برسوں پہلے جب میری فلم ''گائیڈ'' ریلیز ہوئی تھی تو بال ٹھاکرے اسے دیکھنے کے بعد مجھے مبارکباد دینے میرے گھر آئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے بھولے نہیں ہوں گے۔ انہوں نے مجھے اندر بلوایا اور خاصے احترام سے میرا استقبال کیا۔ میری تواضع کے لیے انہوں نے بیئر منگوائی اور خود بھی بیئر کا گلاس لے کر بیٹھ گئے۔ آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو کر، نہایت پرسکون انداز میں بیئر کی چسکیاں اور سگار کے کش لیتے ہوئے وہ فلمی نہیں بلکہ حقیقی گاڈ فادر یا ڈون دکھائی دے رہے تھے۔ منوہر جوشی قریب کھڑا دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس زمانے میں بال ٹھاکرے کا سب سے پسندیدہ آدمی اور دست راست تھا۔

''گائیڈ'' کی ریلیز کے برسوں بعد بال ٹھاکرے نے اپنی پارٹی کی ترجمانی کے لیے ''سامنا'' کے نام سے ایک روزنامہ نکالا تھا۔ انہوں نے اس کی افتتاحی تقریب میں مجھے بھی خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے میں نے امید ظاہر کی تھی کہ قوم کو حالات و واقعات سے باخبر رکھنے میں بال ٹھاکرے صاحب کا اخبار یقیناً ایک انقلابی کردار ادا کرے گا۔ ظاہر ہے، جب آپ اس قسم کی پارٹیوں کی کسی تقریب میں بلائے جاتے ہیں، تو اسی قسم کی تقریریں کرتے ہیں۔

بیئر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بال ٹھاکرے نے میری آمد کا مقصد پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میری فلم کی کاسٹ میں شامل لڑکی فاطمہ شیخ پاکستانی ہرگز نہیں تھی۔ وہ تو سیکولر انڈیا میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی تھی، ان کے ضرورت سے زیادہ جوشیلے اور مستعد کارکنوں نے انہیں غلط اطلاع دی تھی۔ بال ٹھاکرے نے وعدہ کیا کہ وہ خود اس معاملے کو دیکھیں گے اور اب میری فلم کے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔

میں جب بال ٹھاکرے کا شکریہ ادا کر کے ان کے ہاں سے روانہ ہوا تو سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا میں واقعی دنیا کی ''سب سے بڑی جمہوریہ'' کا شہری تھا جس کے ایک بہت بڑے حصے میں بال ٹھاکرے جیسے لوگوں کا حکم چلتا تھا، جو کسی کی بھی فلم کی نمائش رکوا سکتے تھے اور کسی کو بھی قابل گردن زدنی قرار دے سکتے تھے؟

o.....o.....o

ٹیلیفون یوں تو سب ہی کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن مجھے اپنی زندگی میں اس لئے ٹیلیفون کا کردار کچھ زیادہ اہم لگتا ہے کہ بعض اوقات کسی لڑکی سے فون پر میری بات ہوئی اور وہ میری کسی فلم کا اہم کردار بن گئی۔ کبھی کسی صاحب سے فون پر رابطہ ہوا اور آگے چل کر وہ میری فلم کے پروڈیوسر بن گئے۔ ایک صاحب نے کوپن ہیگن سے دو تین مرتبہ مجھے فون کیا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ ان سے بات نہیں ہو سکی۔ اسی دوران وہ انڈیا آ گئے اور ان سے ملاقات طے ہو گئی۔ ان کا نام ہروانی تھا۔ وہ ملاقات کے لیے آئے تو میں نے دیکھا، وہ تھری پیس سوٹ میں تھے اور ایک اچھا سا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھے۔ گفتگو ہوئی تو وہ نہایت شائستہ، نرم مزاج اور ذہین آدمی معلوم ہوئے۔ بعد کی ملاقاتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ہمیشہ ہی بریف کیس لے کر گھر سے نکلتے تھے۔ وہ میرا بہت احترام کرتے تھے اور خواہشمند تھے کہ میں ان کے لیے ایک فلم بناؤں۔

''مسٹر ہروانی! میں فلمیں صرف اپنے لیے بناتا ہوں، باہر کے لوگوں کے لیے نہیں۔'' میں نے نرمی سے جواب دیا۔

''آپ مجھے باہر کا آدمی نہ سمجھیں، جو لوگ آپ کے پرستار ہیں، آپ کے مداح ہیں، وہ ایک طرح سے آپ کے خاندان کے فرد ہیں۔'' ہروانی نے فوراً دلیل دی۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ ''آپ کبھی کوپن ہیگن گئے ہیں؟''

''میں اسکینڈے نیوین ملکوں سے گزرا ہوں لیکن صحیح طور پر میں نے ان میں سے کوئی ملک یا ان کا کوئی شہر نہیں دیکھا۔'' میں نے جواب دیا۔ کوپن ہیگن، ڈنمارک کا دارالحکومت تھا۔ مجھے وہاں جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔

''آپ میری دعوت پر ڈنمارک آئیں۔ میں آپ کو کار میں سویڈن اور ناروے بھی لے چلوں گا۔'' اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ مجھے اس کی تجویز میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

''ٹھیک ہے..... مجھے جب بھی فرصت میسر آئی اور میرا چھٹیاں منانے کا موڈ ہوا تو میں ضرور آؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

ہروانی بہت بری طرح میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ کوپن ہیگن واپس جانے کے بعد بھی مجھے فون کرتا رہا۔ پھر اس نے جہاز کا، فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بھیج دیا۔ آخرکار میں کوپن ہیگن جا ہی پہنچا۔ ہروانی نہ صرف تازہ اور مہکتے پھولوں کا گلدستہ لیے ایئرپورٹ پر موجود تھا، بلکہ اس نے میرے لیے وہاں باقاعدہ سرخ قالین بچھوایا۔ ایئرپورٹ والے بھی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ کس اہم مہمان کے لیے ریڈ کارپٹ کا اہتمام ہو رہا ہے۔

ہروانی نے مجھے شہر کے بہترین ہوٹل کے بہترین سوئٹ میں ٹھہرایا۔ وہ وہاں کا نہایت متمول اور اہم شہری تھا۔ وہ کمرے میں ایک پیکٹ میں میرے لیے کافی مقامی کرنسی بھی چھوڑ گیا۔ وہ ہر پہلو سے میرا خیال رکھ رہا تھا۔ دوسرے روز اس نے گھر لے جا کر مجھے اپنی فیملی سے ملوایا۔ ان سب کے طور طریقے، لب و لہجہ اور پہناوا یورپین لوگوں جیسا تھا لیکن وہ سب میرے مداح تھے۔ ہروانی کی دو پیاری سی بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔

رات کو ہم ایک بہت ہی شاندار ریسٹورنٹ ''اسکالا'' میں ڈنر کے لیے گئے۔ میں نے کوپن ہیگن میں سب سے خاص بات یہ محسوس کی کہ وہاں لوگوں کے چہروں پر خوشی اور صحتمندی کی چمک تھی۔ وہاں کوئی بھی اداس، پژمردہ یا دل گرفتہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس اعتبار سے شاید وہ خوابوں کا شہر تھا۔ دوسرے روز ہم ایک اور شہر ٹیوولی گئے۔ یہ بھی زندہ دلوں کا شہر تھا جہاں تفریحات کی بھرمار تھی۔ شاید والٹ ڈزنی کو یہی شہر دیکھ کر 'ڈزنی لینڈ' بنانے کا خیال آیا تھا۔ میں اس شہر میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ یہاں میں نے فلم ''پیار محبت'' کے لیے سائرہ بانو کے ساتھ کئی رومانی سین پکچرائز کرائے تھے اور وہ ٹوپی بھی خریدی تھی جو ''جیول تھیف'' میں پہنی تھی اور جو کافی حد تک میری پہچان بن گئی تھی۔

ہم کوپن ہیگن کے علاقے کرسٹیانا بھی گئے جو گویا اس شہر کا دوسرا رخ تھا۔ یہ نشے بازوں کا علاقہ تھا جہاں مختلف منشیات کے زیر اثر لوگ اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح بہت خوش تھے۔ بس ان کا خوش رہنے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ حکومت کو ان کے نشوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس نے نہ جانے کس طرح ان لوگوں کو باقی لوگوں سے الگ کیا ہوا تھا۔ اسکینڈے نیوین ملکوں میں کسی بھی چیز پر کوئی خاص پابندی نہیں ہے۔ جس کا، جس طرح دل چاہے، زندگی گزار سکتا ہے۔ کوپن ہیگن میں ایک ہی دن میں، میں نے اتنی زیادہ تعداد میں، بے انتہا حسین عورتیں دیکھیں کہ میرا دل چاہا، کاش میں کوئی ایسا بادشاہ ہوتا جو ان سب سے شادی کر سکتا۔

دو دن بعد ہم نے ڈنمارک کی سرحد عبور کی، جو صرف دو گھنٹے کی ڈرائیو پر تھی۔ ہم ایک فیری کے ذریعے اپنی کار سمیت سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم پہنچ گئے جو انگرڈ برگ مین، گریٹا گاربو اور انگمار برگ مین جیسی مشہور زمانہ فلم اسٹارز اور حسین خواتین کا شہر تھا۔ اس شہر..... اور یہاں رہنے والوں کی خوبصورتی کے بے شمار نقوش اور یادیں ذہن میں لیے ہوئے ہم واپس آئے۔ پھر ہم نے ناروے کے دورے کا پروگرام بنایا۔ ہروانی ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ تمام راستوں سے گزرتے اور فطری حسن کا نظارہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک فلم کا تانا بانا جنم لینے لگا۔ ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں برف پڑ رہی تھی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم تھی لیکن ریسٹورنٹس اور شراب خانوں میں خوب رونق اور حرارت تھی۔ اس سفر سے واپسی تک میں ڈنمارک وغیرہ کے پس منظر میں فلم بنانے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکا تھا۔ تیاریاں کرنے کے لیے میں نے ہروانی سے دو ماہ کی مہلت مانگی۔

اس فلم کے لیے میرے ذہن میں سب سے پہلے پاکستانی ماڈل اور ٹی وی آرٹسٹ انیتا ایوب کا خیال آیا۔ وہ ان دنوں چھٹیاں گزارنے انڈیا آئی ہوئی تھی۔ وہ شاید اپنے ملک کی پہلی اور آخری ماڈل تھی جس نے کسی مقابلۂ حسن میں حصہ لیا تھا اور اس میں جیتی بھی تھی۔ اس کی رنگت، بالوں کا رنگ اور جسمانی ساخت اس تصور کے عین مطابق تھی جو میں نے اس فلم کی ہیروئن کے لیے ذہن میں تراشا تھا۔ انیتا ایوب ایک مداح کے طور پر مجھ سے ملنے آئی تھی لیکن میں نے اسے اپنی آئندہ فلم ''پیار کا ترانہ'' کی ہیروئن بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ نام میں نے اپنی اس فلم کے لیے سوچا تھا جو میں ڈنمارک میں بنانا چاہتا تھا.....

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں جسے غریب سی لڑکی سمجھا، وہ بے پناہ دولت مند تھی

قسط : 34

تمکین تبسم

اپنی اس فلم کے لیے میں نے انیتا ایوب کے علاوہ ایک اور لڑکی 'منک' کو کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ منک سے میں ٹیلیفون کے ذریعے متعارف ہوا تھا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے زیادہ تر فون خود ہی سنوں۔ چنانچہ مجھے طرح طرح کے لوگوں کے عجیب و غریب فون بھی سننے پڑتے ہیں۔ ایک روز میں نے گھنٹی بجنے پر فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آنے والی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دو کم عمر لڑکیاں ہیں جنہوں نے صرف شرارت کے طور پر مجھے فون کیا ہے یا پھر شاید وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے ایک آدھ جملہ فرانسیسی میں بھی بولا۔ آخر کار انہوں نے اپنا مقصد بیان کر دیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں دوسرے دن کا وقت دے دیا۔

وہ ملاقات کے لیے گھر آئیں تو پتہ چلا، واقعی وہ دونوں کم عمر تھیں۔ دونوں کی عمریں چودہ، پندرہ سال ہوں گی لیکن دونوں خوبصورت اور ماڈرن تھیں۔ ان کے لباس بھی جدید تھے۔ اپنی شخصیت اور لباس سے وہ کسی مغربی ملک کی ماڈلز معلوم ہو رہی تھیں۔ تاہم ان میں مشرقی ملکوں والا شرمیلا پن بھی موجود تھا۔ درحقیقت وہ انڈین تھیں لیکن جرمنی میں پیدا ہوئیں اور پلی بڑھی تھیں۔ انہیں تھوڑی بہت فرانسیسی بھی آتی تھی۔ ان میں سے ایک کی ماں جرمن تھی اور باپ انڈین۔ اس لڑکی کا نام 'منک سنگھ' تھا اور اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔

''میں جس فلم کا ان دنوں منصوبہ بنا رہا ہوں، اس میں شاید ایک ایسا کردار نکل آئے جس میں تم جچ سکو..... لیکن فلم میں کام کرنے کی بات چیت کرنے کے لیے تمہیں اپنی والدہ کو ساتھ لے کر آنا ہوگا۔'' میں نے گہری نظر سے اس کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

''میں کل انہیں ساتھ لے آؤں گی۔ وہی تو اصل میں آپ کی بہت بڑی پرستار ہیں۔'' منک نے اپنے مخصوص شرمیلے سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''اب میری پرستار خواتین میں زیادہ تر ایسی ہی ہیں جن کے بچے جوان ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز منک کی والدہ اس کے ساتھ آئیں تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی بیٹی کی ماں کے بجائے اس کی بڑی بہن لگ رہی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی میں گویا خوبصورتی، جدید لباس اور اسٹائل کے معاملے میں مقابلہ چل رہا تھا۔ اس خاتون نے ہیروں کے کئی ایسے زیورات پہن رکھے تھے جن کی وجہ سے کمرا گویا جگمگا اٹھا۔ ماں بیٹی سے بات چیت بے حد خوشگوار رہی اور آگے چل کر جب ''پیار کا ترانہ'' کا منصوبہ کچھ واضح ہوا تو منک اس کی کاسٹ میں دوسری ہیروئن کے طور پر شامل ہو چکی تھی۔

کہانی کے مطابق فلم میں ایک لڑکی ڈنمارک سے بھی ہونی چاہیے تھی۔ اس کی تلاش میں مجھے دوبارہ کوپن ہیگن جانا پڑا۔ یہ شہر انتہائی حسین اور پھولوں کی طرح تر و تازہ لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ڈنمارک کے ایک اخبار میں لڑکی کی تلاش کے سلسلے میں اشتہار دیا جا چکا تھا۔ میرے پہنچنے کے بعد ایک مقامی ٹی وی چینل پر میرا انٹرویو بھی چل چکا تھا۔ میں نے اس میں بھی ذکر کیا تھا کہ میں ڈنمارک میں ایک فلم شوٹ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ اس انٹرویو کی وجہ سے عوامی مقامات پر لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔

ہمارے اشتہار کے جواب میں جتنی امیدوار لڑکیاں انٹرویو دینے آئیں، ان کی تعداد دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ ڈنمارک میں لوگ انگریزی آسانی سے سمجھ لیتے تھے ورنہ ڈینش زبان تو ہمیں آتی نہیں تھی۔ انٹرویو کے لیے آنے والی لڑکیوں میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین لڑکی شامل تھی۔ ان میں سے ایک لڑکی کا قد چھ فٹ آٹھ انچ تھا۔ مجھے اس سے بات کرنے کے لیے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ روانی سے انگریزی بول رہی تھی اور اتنی لمبی ہونے کے باوجود انتہائی حسین لگ رہی تھی۔ اس کا جسم گویا ایک حسین سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ سرتاپا حسن تھی۔ وہ رخصت ہوئی تو میں اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ وہ اس قابل تھی کہ اسے ہیروئن لینے کے لیے خاص طور پر ایک فلم بنائی جا سکتی تھی لیکن میں اسے ''پیار کا ترانہ'' میں ہیروئن نہیں لے سکتا تھا کیونکہ ہمارے ہیرو کا قد اس سے کافی چھوٹا تھا۔

میرے ذہن میں اپنی ڈینش ہیروئن کا جو تصور تھا، وہ لڑکی مجھے نوجوانوں کی ایک تفریح گاہ میں ملی۔ وہ بے پناہ حسین، معصوم صورت اور کم عمر تھی۔ میں نے جب اسے فلم میں کام کرنے کی دعوت دی تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے کبھی فلم میں کام کرنے..... اور خاص طور پر کسی انڈین پروڈیوسر، ڈائریکٹر کی فلم میں کام کرنے کا تو بالکل ہی نہیں سوچا تھا۔ بہرحال، تفصیلی بات چیت کے بعد وہ راضی ہو گئی۔

''پیار کا ترانہ'' کی اسکینڈے نیوین ملکوں میں شوٹنگ ایک حسین اور پُرلطف تجربہ تھا۔ اس کے آغاز کے منظر کے طور پر ہم نے ''ڈینش فیسٹیول'' پکچرائز کیا تھا جو کوپن ہیگن کی گلیوں اور بازاروں میں منعقد ہوتا تھا۔ اس میلے میں شہر بھر کی خوبصورت عورتیں گلیوں بازاروں میں ایک عجیب موسیقی کی دھن پر بے تکلفانہ رقص کرتی تھیں۔ ہم نے نہایت خوبصورت، منفرد اور قابلِ دید مقامات پر شوٹنگ کی اور ایک قسم کی طویل پکنک کے انداز میں وہ حصہ مکمل کیا جو ہمیں ان ملکوں میں فلمانا تھا۔

اس فلم سے میری بہت سی حسین یادیں وابستہ ہیں لیکن افسوس، کہ فلم مکمل ہو جانے کے بعد کی یادیں کچھ خوشگوار نہیں۔ فلم چونکہ کاروباری طور پر فائدہ مند ثابت نہیں ہوئی، اس لیے ہروانی بھی وہ پہلے جیسے ہروانی نہیں رہے جنہوں نے بصد اصرار مجھے فلم بنانے پر مجبور کیا تھا اور فلم مکمل ہونے تک جو مجھ پر فریفتہ اور قربان تھے۔ توقعات پوری نہیں ہوئیں تو ان کا رویہ بدل گیا اور ہماری مختصر سی رفاقت کا اختتام ناخوشگواری پر ہوا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہروانی درحقیقت کتنا خالص کاروباری آدمی تھا۔

بہرحال اس کے ساتھ مل کر فلم بنانے سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ حد سے زیادہ کاروباری آدمی کے ساتھ فلمسازی میں شریک ہونا بے وقوفی ہے۔ حد سے زیادہ کاروباری آدمی ہر کام میں منافع کی توقع رکھتا ہے جبکہ فلم میکنگ کبھی کبھی گھاٹے کا سودا بھی ثابت ہوتی ہے۔

میں جب ''پیار کا ترانہ'' سے فارغ ہوا تو انہی دنوں انڈیا کے تمام اخبارات میں ایک خبر چھپی جس نے مجھے احساس دلایا کہ جرائم پیشہ گروہ کس قدر منظم ہو چکے تھے اور ان کے حوصلے کتنے بڑھ چکے تھے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ بیرون ملک سے آئے ہوئے کسی جعلی بزنس مین نے بمبئی کے چند بڑے تاجروں کو دہلی مدعو کیا تھا جہاں وہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا اور خوب شان و شوکت کے مظاہرے کر رہا تھا۔ اس نے دولت مند تاجروں کے ساتھ کروڑوں کے کاروباری معاہدے کرنے کا جھانسا دے کر انہیں بلایا تھا۔

وہ دہلی جا کر اسی ہوٹل میں ٹھہرے اور پھر غائب ہو گئے۔ وہ جعلی بزنس مین بھی غائب ہو چکا تھا جس کی دعوت پر وہ آئے تھے۔ پتا یہ چلا کہ درحقیقت انہیں اغوا کر لیا گیا تھا۔ اخبارات نے یہ کہانی نہایت سنسنی خیز انداز میں پیش کی۔ یہ معاملہ تو اپنی جگہ چلتا رہا..... اور یہ ایک الگ قصہ ہے..... بہرحال اس خبر سے میرے ذہن میں آئندہ فلم کا خیال ابھرا جس کا نام میں نے ''گینگسٹر'' رکھا۔

دیوآنند اور جین

اس فلم کے کچھ حصے کی شوٹنگ کے لیے میں بیلجیئم کے شہروں اینٹورپ اور لکسمبرگ بھی گیا جو کچھ عرصے بعد بننے والی یورپی یونین کا مالیاتی مرکز بھی بنا۔ وہ اس وقت بھی یورپی ممالک کی معاشی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جبکہ اینٹورپ دنیا بھر میں ہیرے جواہر کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دنیا میں ہیرے جواہر کے سب سے بڑے یہودی تاجر اسی شہر میں پائے جاتے تھے۔ کچھ انڈین تاجروں کو بھی یہاں اس قسم کے دولتمندوں کے شانہ بشانہ چلنے کا موقع ملتا تھا۔ تجارت و معیشت کے مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ دونوں شہر بے حد خوبصورت بھی تھے۔

ایک روز میں ایک خوبصورت چوراہے پر شوٹنگ کر رہا تھا اور منک کو ہدایات دے رہا تھا جب میں نے محسوس کیا کہ فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوئی کچھ یورپی لڑکیاں دلچسپی سے شوٹنگ دیکھ رہی ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی شوٹنگ میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ حقیقت کا تاثر دینے کے لیے ان میں سے خوبصورت ترین لڑکی کو سین میں شامل کر لیا جائے۔ منک کو اس سین میں سیکسوفون بجاتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوئی ایک خوبصورت یورپی لڑکی کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا۔

نہایت چھوٹا سا کردار ادا کرنے کے لیے میں نے اس لڑکی کو جو کچھ سمجھایا، وہ اس نے بہت عمدگی سے کیا اور اس کی وجہ سے سین میں جان سی پڑ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی عام اور غریب سی لڑکی تھی مگر پہلی مرتبہ فلمی کیمرے کا سامنا بڑے اچھے طریقے سے کر گئی تھی۔ میں نے جب اسے جانے کی اجازت دے دی تو اس نے پوچھا کہ کیا میں اس سے مزید کچھ کام لینا پسند کروں گا؟ میں نے کہہ دیا ''فی الحال تو بس اتنا ہی.....''

وہ شکریہ ادا کر کے، پیدل ایک طرف کو چلی گئی۔ دوسرے روز میں کسی اور مقام پر شوٹنگ کر رہا تھا۔ جب میں چند شاٹس لینے کے بعد وقفے کے دوران فٹ پاتھ پر اپنی کرسی پر جا بیٹھا تو ایک بڑی سی، نہایت شاندار اور قیمتی کار میرے پاس آ کر رکی۔ وہی لڑکی ڈرائیونگ سیٹ سے اتری جس سے کل میں نے ایک سین میں معمولی سا کام لیا تھا۔ وہ بڑی گرمجوشی سے آ کر مجھ سے ملی۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس کا نام پوچھا۔

''جین.....'' اس نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

پتا چلا کہ میں جسے فٹ پاتھ پر، معمولی سی جینز اور شرٹ میں دیکھ کر، کالج کی کوئی طالبہ یا کوئی اور عام سی لڑکی سمجھ رہا تھا، وہ ایک نہایت دولت مند لڑکی تھی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے کسی قریبی، مگر بے اولاد عزیز کا انتقال ہونے پر، اس کی وصیت کے مطابق اس کی تمام دولت و جائیداد اسے مل گئی تھی اور وہ بیٹھے بٹھائے کروڑ پتی ہو گئی تھی۔ ایک شاندار علاقے میں اس کا محل نما مکان تھا۔ اس نے مجھے وہاں شوٹنگ کی دعوت بھی دی لیکن میں نے اسے بتایا کہ اس فلم میں تو اب کسی ایسی جگہ شوٹنگ کی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن اگر اپنی کسی آئندہ فلم میں ضرورت پڑی تو میں ضرور اس سے رابطہ کروں گا۔ اس نے اپنا نہایت خوبصورت، نفیس اور طلائی حاشیے سے آراستہ وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا اور الوداعی انداز میں اپنا نازک سا ہاتھ ہلا کر رخصت ہو گئی۔ وہ اتنی دولتمند تھی لیکن اس میں ذرا بھی نخرا یا تکبر نہیں تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر برگر کھانے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔

میں اس کے جانے کے بعد دیر تک اس کی سادگی کے بارے میں سوچتا رہا۔

بمبئی واپس آنے کے بعد میں ایک احمقانہ قسم کے تنازعے میں الجھ گیا۔ ایک بڑے فلمی میگزین میں لکھنے والے ایک صحافی نے ایک بڑے ایکٹر کے بارے میں کہانی چھاپ دی تھی کہ اس نے ایک ہیروئن کے ساتھ سیٹ پر آنے والی اس کی چھوٹی بہن سے زبردستی بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔ بات کافی بڑھ گئی تھی۔ یہ اسٹوری چھپنے کے بعد ایکٹر کا اس صحافی سے سامنا ہوا تو تلخ کلامی ہو گئی۔ صحافی نے جا کر نمک مرچ لگا کر اس سلسلے میں مزید تفصیلات چھاپ دیں۔

ایکٹر نے اپنی ایسوسی ایشن میں درخواست دے کر بڑے بڑے اداکاروں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ رفتہ رفتہ پریس اور فلم انڈسٹری کے درمیان شدید محاذ آرائی کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا بائیکاٹ کر دیا۔ ایک طرف فلم انڈسٹری متحد ہو گئی تھی تو دوسری طرف پریس متحد ہو گیا تھا۔ اسٹوڈیوز میں پریس والوں کا داخلہ بند ہو گیا تھا اور پریس والوں نے فلم والوں کے بارے میں کچھ بھی نہ چھاپنے کا اعلان کر دیا.....

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

دورۂ لاہور کی یاد ہمیشہ

ذہن میں روشن رہی

تمکین تبسم

میں نے فلم انڈسٹری اور پریس کے اس تنازعے میں پریس کی حمایت کر ڈالی۔ میرا مؤقف یہ تھا کہ ہمارا ملک جمہوری ہے اور پریس ہمارے ہاں آزاد ہے۔ شوبز اور پریس کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، دنیا بھر میں شوبز کے لوگوں کے اسکینڈلز چھپتے رہتے ہیں، وہ ان کی پروا نہیں کرتے یا پھر اصل صورت حال اور اپنا مؤقف بیان کر دیتے ہیں۔

میرے یہ خیالات ایک انٹرویو کی صورت میں اخبارات و رسائل میں چھپ بھی گئے۔ میں نے یہ سب کچھ کسی مصلحت کے تحت نہیں کہا تھا۔ میں واقعی صدقِ دل سے یہی نظریات رکھتا تھا لیکن میرے اس انٹرویو کی بنا پر پوری فلم انڈسٹری میرے خلاف ہو گئی۔ ہر شعبے کی ایک ایسوسی ایشن بنی ہوئی تھی اور اداکاروں کی ایسوسی ایشن کا دیگر تمام ایسوسی ایشنز پر بہت زیادہ اثر رسوخ تھا۔ انہوں نے دباؤ ڈال کر سب ہی ایسوسی ایشنز کو میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور کر دیا۔ یوں میں گویا اس فلم انڈسٹری کے لیے اچھوت ہو گیا جس میں کام کرتے ہوئے میں نے اپنی پوری جوانی گزار دی تھی۔

آخر کار میں نے ایکٹرز اور پروڈیوسرز ایسوسی ایشن میں درخواست دی کہ کم از کم ایک بار مجھے اپنا مؤقف بیان کرنے کا موقع دیا جائے، اس کے بعد فلم انڈسٹری کا جو بھی فیصلہ ہوگا، میں اس کے مطابق عمل کروں گا۔ تمام ایسوسی ایشنز کے نمائندوں پر مشتمل ایک کافی بڑی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ میں اس کمیٹی کے سامنے اس طرح پیش ہوا کہ ایک بڑے سے نیم دائرے میں تمام ارکان بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک کرسی پر میں تنہا کسی ملزم کی طرح بیٹھا تھا۔

میں نے اس کمیٹی کے سامنے انگریزی میں ایک طویل تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فلم انڈسٹری جدید دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھ رہی تھی اور معمولی سی بات پر اپنا بہت بڑا نقصان کر رہی تھی۔ مجھ اکیلے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ میرا ہنر، میری صلاحیتیں اور میرے آئیڈیاز میرے دماغ میں تھے۔ میں اس فلم انڈسٹری کا محتاج نہیں تھا، میں اپنا ہنر اور اپنے آئیڈیاز ساتھ لے کر ملک سے باہر جا سکتا تھا۔ میں کسی بھی ملک میں بیٹھ کر اپنا کام جاری رکھ سکتا ہوں لیکن فلم انڈسٹری اس طرح کے فضول اور چھوٹے موٹے جھگڑوں میں الجھ کر بڑے بڑے اقدامات کر کے کب تک اپنا بہت زیادہ نقصان کرتی رہے گی؟

کمیٹی کے تمام ارکان خاموشی سے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے میری تقریر سنتے رہے۔ میری تقریر ختم ہونے پر بھی کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ میں اٹھا اور حتی الامکان باوقار انداز میں چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر پریس والے اس میٹنگ کا نتیجہ جاننے کے لیے جمع تھے۔ انہوں نے بے تابی سے مجھے گھیر لیا اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میرے پاس انہیں سنانے کے لیے کوئی خبر نہیں تھی، تاہم میں ان کی نظر میں ہیرو تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ میں ان کا مقدمہ لڑ رہا ہوں۔

بہرحال، میری اس تقریر کے نتیجے میں فلم انڈسٹری اور پریس، دونوں فریق ایک ایک قدم پیچھے ہٹے، حالات بہتری کی طرف گامزن ہوئے، دونوں فریقوں کے درمیان صلح ہو گئی اور کچھ دنوں میں صورت حال معمول پر آ گئی۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ میرا فلم پروڈکشن کا کام اس دوران بالکل ہی ٹھپ ہو گیا تھا اور میرے اسٹوڈیو پر تالا لگ گیا تھا۔ صلح اور معاہدہ ہونے کے بعد میرا اسٹوڈیو کھل گیا۔ تمام ہنرمندوں اور کارکنوں نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔

o.....o.....o

میری فلم ''گینگسٹر'' جب ریلیز ہوئی تو مجھے فلم انڈسٹری میں کام کرتے ہوئے 50 سال ہو چکے تھے۔ یعنی وہ میرے کیریئر کی گولڈن جوبلی تھی۔ ابتدا میں، میں نے فلم انڈسٹری میں اداکار کے طور پر اور بعد میں ڈائریکٹر، پروڈیوسر کے طور پر کام کیا۔ لوگوں کی نظر میں میری کامیابیاں قابل رشک تھیں لیکن میری اپنی نظر میں یہ کچھ خاص نہیں تھیں۔ میں تو نہ جانے کیا کچھ کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال، بہت سے لوگ میرے کیریئر کی گولڈن جوبلی منانا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں بے شمار تجاویز سامنے آ رہی تھیں۔ تقریب کے لیے مختلف شہر اور مختلف مقامات تجویز کیے جا رہے تھے۔

آخر کار میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر گولڈن جوبلی منانی ہی ہے تو اس کے لیے پونا موزوں ترین جگہ تھی جسے اب پونے کہا جاتا ہے۔ یہ شہر میرے خیال میں اس لیے موزوں تھا کہ یہاں سے میں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا اور اس کے ساتھ میری بہت سی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ وہاں کا پربھات اسٹوڈیو جہاں میں نے آڈیشن دیا تھا، اس میں اب ''فلم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا'' قائم تھا۔

تقریب کے لیے میں نے کار کے بجائے ٹرین میں پونا جانے کا فیصلہ کیا۔ ٹرین میں بھی میں نے اعلیٰ درجے میں جانے کے بجائے سیکنڈ کلاس میں سفر کیا۔ میں چاہتا تھا کہ عام آدمیوں کے ساتھ سفر کروں، ان کے ساتھ ہاتھ ملاؤں اور باتیں کروں، کیونکہ درحقیقت عام آدمیوں نے ہی دیو آنند کو دیو آنند بنایا تھا۔ مجھے اپنے اس فیصلے پر بہت خوشی ہوئی۔ اس سفر کے دوران ہر اسٹیشن پر میرے لیے جس طرح لوگوں کا ہجوم لگا، جس طرح والہانہ انداز میں لوگ مجھ سے ملے اور جس طرح ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے، اس پر تشکر کے جذبے سے میرا دل بھر آیا۔ عام اور نچلے طبقات کے لوگ تو گویا مجھے دیوتا کا درجہ دے رہے تھے۔ میں نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ مجھے اتنی عزت، اتنا احترام دے رہے تھے۔

پونا میں میرا استقبال کچھ اس طرح ہوا جیسے میں کسی ملک کا بادشاہ ہوں۔ پونا کے میئر شیرواکر، خوبصورتی سے سجی ہوئی ایک بگھی میں مجھے اپنے ساتھ لے کر اس اسٹیڈیم کی طرف روانہ ہوئے جہاں میرے اعزاز میں ایک قسم کی تقریب پذیرائی کا اہتمام تھا اور مجھے ایک تمغۂ اعزاز دیا جانا تھا۔ راستے میں دونوں طرف ہزاروں لوگ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ میں تمام راستے ان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلاتا رہا۔ میں اسٹیڈیم پہنچا تو وہاں میری آمد کی خوشی میں دیر تک آتش بازی ہوتی رہی۔ اپنی اس قدر پذیرائی دیکھ کر میرا دل خوشی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کے جذبۂ تشکر سے بھی سرشار تھا۔ انسان کو زندگی میں اس قدر عزت اور مقبولیت حاصل ہو جائے تو اور کیا چاہیے؟ میں نے اب تک جتنی بھی محنت کی تھی، مجھے اس سے زیادہ صلہ مل گیا تھا۔

میرے لیے تقریبات پذیرائی اور اعترافِ فن کا سلسلہ آنے والے برسوں میں بھی جاری رہا۔ لکھنؤ، بھوپال، اندور، دہلی، کلکتہ، جو اب کولکتہ کہلاتا ہے..... مدراس، جو اب چنائے بن چکا ہے..... ان سب شہروں میں میرے اعزاز میں مثالی تقریبات منعقد ہوئیں۔ کہیں کسی صوبے کے گورنر میرے استقبال کے لیے آئے اور کہیں کسی وزیراعلیٰ نے اپنا طیارہ مجھے لینے کیلئے بھیجا۔ کہیں مجھے کوئی ایوارڈ دیا گیا اور کہیں کسی دوسرے اعزاز سے نوازا گیا۔ ہر جگہ یادگار استقبال ہوا اور ہر جگہ لوگوں نے اہتمام کے سلسلے میں نت نئی روایات قائم کرنے کی کوشش کی حتیٰ کہ ناگپور میں بھی میرے اعزاز میں تقریب منعقد ہوئی۔

میری عمر اس دوران 72 سال ہو چکی تھی اور میرے پاس یادوں کا ایک بہت بڑا خزانہ تھا۔ میں اب اپنے اسٹوڈیو کی چھت پر ایک پینٹ ہاؤس میں رہتا تھا۔ ایک روز میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنے حسین اور نشیب و فراز سے پُر، ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور میں نے ایک دبلے پتلے دراز قد شخص کو سامنے کھڑے پایا جو سفید، شکن آلود کرتے پاجامے میں تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بھی سفید اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور گلے میں ایک بیگ لٹکائے ہوئے تھا۔

''آیئے..... آیئے..... ایم۔ ایف حسین صاحب.....!'' میں نے بازو پھیلا کر گرمجوشی سے اس کے استقبال کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ درویشوں کے سے حلیے میں رہنے والے مشہور زمانہ مصور ایم۔ ایف حسین تھے۔ ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے لیکن احتراماً ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرتے وقت ''صاحب'' کا لاحقہ بھی استعمال کرتے تھے۔

گلے ملنے کے بعد وہ میرے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے ''کافی عرصے سے تمہاری کامیابیوں کے بڑے چرچے ہیں اور تمہارے اعزاز میں بڑی بڑی تقریبات منعقد ہو رہی ہیں۔ میں نے سوچا، میں خود آ کر تمہیں مبارکباد دوں۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے لیے کافی وغیرہ منگوائی۔ انہوں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک سفید کارڈ بورڈ اور چند رنگین موم پنسلیں نکالیں۔ وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے اور مجھ سے باتیں کرتے کرتے انہوں نے چند سیکنڈ میں میرا اسکیچ بنا ڈالا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

''تیرے میرے سپنے'' میں اپنے بھائی وجے آنند کے ساتھ

میری یادوں کے خزانے میں امریکا کے بہت سے شہروں کے بیسیوں دورے بھی ہیں۔ کبھی مجھے شوٹنگ کے سلسلے میں جانا پڑا، کبھی کوئی ایوارڈ لینے اور کبھی اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریباتِ پذیرائی میں شرکت کیلئے۔ ان تمام دوروں کی یادوں کا خزانہ اتنا وسیع ہے کہ ان کے تذکرے کے لیے مجھے ایک الگ کتاب لکھنی پڑے گی۔

دیو آنند، دھرمیندر

پران اور منوج کمار کے ساتھ، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملنے کے موقع پر

مجھے نیویارک کے ٹائمز اسکوائر پر نئے سال کے استقبال کے سلسلے میں ہونے والی تقریب اور 31 دسمبر کی رات بارہ بجے جمع ہونے والے انسانوں کے سمندر کو بھی کئی بار نہ صرف دیکھنے بلکہ اپنی ایک فلم میں اس منظر کو شامل کرنے کے لیے شوٹنگ کرنے کا بھی موقع ملا۔ اس شوٹنگ کے دوران مجھے ایک امریکی عورت آن ملی جو کبھی ایئر ہوسٹس ہوا کرتی تھی۔ اس کا نام باربرا تھا۔ اس سے میری 35 سال پہلے کی ملاقات ایک لمحاتی رومانس میں ڈھل گئی تھی۔

اس نے مجھ سے ٹائمز اسکوائر پر ملنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آئی تھی اور میں اس کے انتظار میں ایک بار میں بیٹھ کر خالص فلمی انداز میں خمار زدہ ہو گیا تھا۔ 35 سال بعد جب میں ٹائمز اسکوائر پر اپنی ایک فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا تو وہ مجھے پہچان کر دوڑی چلی آئی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی تھا جس کے سامنے کے دو دانت نہیں تھے مگر وہ نہایت جوش و خروش سے برگر چبا رہا تھا۔ باربرا کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی جو اتنی ہی بڑی تھی جتنی باربرا 35 سال پہلے تھی، جب اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ گویا اپنی ماں کی جوانی تھی۔ بڑھاپا اور جوانی، ماضی اور حال، دونوں گویا ایک دوسرے کا عکس تھے۔

ان سب یادوں کے ساتھ میرے ذہن میں ایک اور روشن یاد لاہور کے دورے کی ہے۔ 1998ء میں اُس وقت کے بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے ساتھ سرکاری طور پر دوستی بس کے ذریعے جب مجھے لاہور جانے کی دعوت ملی، اس وقت میں شیو بنا رہا تھا۔ میں اتنا ہیجان زدہ ہوا کہ آدھا شیو چھوڑ کر فوراً گاڑی میں بیٹھ کر اس عالم میں اسٹوڈیو پہنچ گیا کہ میرے ایک گال پر شیونگ کریم کی جھاگ بھی لگی ہوئی تھی۔ میرے کارکن مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ مجھے چونکہ اسی روز دہلی پہنچنا تھا، اس لیے میں اسٹوڈیو میں شوٹنگ کینسل کرانے اور شیڈول تبدیل کرنے پہنچا تھا۔

لاہور کا یہ دورہ بلاشبہ یادگار تھا۔ پاکستان کے اس وقت کے وزیراعظم (جو آج کل بھی وزیراعظم ہیں) میاں نواز شریف نے ہمارا استقبال کیا۔ انہیں جب پتا چلا کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا ہوں تو ان کے رویے میں اور بھی زیادہ گرمجوشی آ گئی کیونکہ وہ بھی وہیں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ میں تقریباً 50 سال بعد لاہور آیا تھا۔ اب شہر کو پہچاننا میرے لیے مشکل تھا۔ ٹی وی والوں نے گورنمنٹ کالج میں میرا ایک انٹرویو بھی ریکارڈ کیا جس کے دوران مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں واپس پہنچ گیا ہوں اور میرے سب ساتھی سنگی، کلاس فیلوز میرے اردگرد چل پھر رہے ہیں۔ لاہور کے اس دورے میں میاں نواز شریف نے مجھے پاکستان میں فلم بنانے کی دعوت بھی دی اور تمام سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستی کی بھی بڑی باتیں ہوئیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس وقت ہم یہ باتیں کر رہے تھے، اس وقت کارگل میں دونوں ملکوں کے درمیان نیا تنازع شروع ہو رہا تھا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com

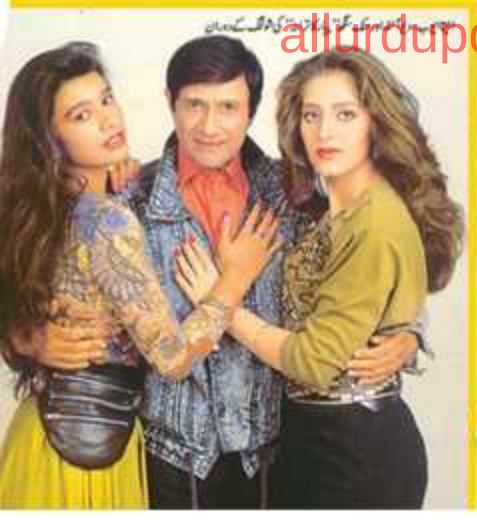

دیو آنند کی داستانِ حیات

میں نہیں چاہتا تھا کہ کیمرا میرے اصلی آنسو دیکھے

آخری قسط

تمکین تبسم

میری فلم ''میں سولہ برس کی'' کے چند مناظر میں سنسر بورڈ نے کچھ اس طرح کاٹ پیٹ کی کہ مجھے اپنے ملکی نظام پر بہت غصہ آیا۔ ہمارے ہاں وہ لوگ فلم سنسر کرتے تھے جنہیں کہانی کے تقاضوں اور فلم کے آرٹ یا اس کی باریکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔ سنسر بورڈ میں بیشتر بیوروکریٹس تھے۔ ان کے سامنے میری ایک نہ چلی۔ میرے دلائل اور بحث و تمحیص کسی کام نہ آئی۔ اس واقعے کی وجہ سے بھی میری وہی پرانی عادت عود کر آئی۔ یعنی میرے ذہن میں ایک فلم کا تانا بانا تیار ہونے لگا۔ آخر کار میں نے ''سنسر'' کے نام سے ایک فلم بنا ڈالی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سنسر کے طریقۂ کار کی خامیوں کی نشاندہی کرنے والی اس فلم پر سنسر بورڈ نے کوئی خاص اعتراض نہیں کیا اور نہایت معمولی سی کاٹ پیٹ کے بعد اسے سرٹیفکیٹ دے دیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ سنسر بورڈ نے اس فلم کی تعریف بھی کی۔ انہوں نے جو معمولی سی کاٹ پیٹ کی، وہ مجھے گراں نہیں گزری۔ فلم انڈسٹری والوں کا خیال تھا کہ میری یہ فلم، سنسر میں جا کر پھنس جائے گی۔ خود مجھے بھی یہی اندیشہ تھا لیکن ہم سب کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔

اسی طرح جب سونیا گاندھی کی قیادت میں کانگریس کو نئی زندگی ملی اور دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد کر کے وہ حکومت بنانے میں کامیاب ہوئی تو ان سیاسی حالات سے متاثر ہو کر میں نے فلم ''مسٹر پرائم منسٹر'' بنا ڈالی۔ 2005ء میں اس فلم کی ریلیز کے وقت میں 82 سال کا ہو چکا تھا۔ میرا فلمی کیریئر ساٹھ سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہو چکا تھا۔

میں اس دوران غیر ممالک میں شوٹنگ مکمل کر کے واپس آیا تو یوں لگا جیسے بہت سے ایوارڈز میرے منتظر تھے۔ یکے بعد دیگرے مجھے یا میری فلموں کو متعدد ایوارڈز ملے۔ ان میں کئی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈز بھی تھے۔ پھر ایک روز فلمی رسالے ''اسکرین'' کے ایک صحافی نے انتہائی جوش و خروش سے اطلاع دی کہ مجھے ''دادا صاحب پھالکے'' ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ اس خبر سے میری رگ و پے میں کوئی سنسنی نہیں دوڑی کیونکہ میں سالوں سے چہ میگوئیاں سنتا آ رہا تھا کہ مجھے یہ ایوارڈ دیا جا رہا ہے، بہت سے لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہتے بھی تھے کہ میں اس ایوارڈ کا مستحق ہوں، لیکن ایوارڈ مجھے نہیں ملا تھا..... اور اب یہ میرے لئے کشش کھو بیٹھا تھا۔

اس سے پہلے بھی حکومت نے میرے لئے ''پدم وبھوشن'' ایوارڈ کا اعلان کر کے بعد مجھے ''پدم بھوشن'' دینے کا فیصلہ کیا جو اس سے ذرا کمتر درجے کا ایوارڈ تھا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں وہ ایوارڈ لینے گیا ہی نہیں..... مجھے شک ہونے لگا تھا کہ شاید بہت سے لوگوں کا وہ خیال درست ہے کہ ایوارڈ، تعلقات، سفارش اور لابنگ کی وجہ سے ملتے ہیں۔

بہر حال، میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ لینے چلا ہی گیا..... اور وہ بلاشبہ میری زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ میں اگلی صف میں بیٹھا تھا اور میرے 60 سالہ فلمی سفر کی جھلکیاں اسکرین پر دکھائی جا رہی تھیں۔ میں نے ان ساٹھ سالوں میں ایکٹر، ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور رائٹر کے طور پر نہ جانے کیا کچھ کیا تھا، کتنا کام کیا تھا، میرے دامن میں یادوں کا نہ جانے کتنا وسیع خزانہ چھپا ہوا تھا۔ میرا بھائی گولڈی، جس نے بطور رائٹر اور ڈائریکٹر، فلم انڈسٹری کو بہت سی یادگار فلمیں دی تھیں، وہ اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

اس کی موت پر میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ ہم بچپن میں ساتھ کھیلے کودے تھے۔ پھر پیشہ ورانہ زندگی میں برسوں، دن رات ساتھ رہے تھے۔ رنگا رنگ رفاقت کی یہ کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میرے بڑے بھائی چیتن اور ان سے بڑے بھائی موہن بھی اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ میں نے ان صدموں سے گزرنے کے بعد بھی بالکل جوان اور توانا لوگوں کی طرح زندگی کے تمام محاذوں پر اپنی پیش قدمی جاری رکھی تھی۔

میں خود بھی اپنے کام کے دوران ایک مرتبہ ملک میں اور تین مرتبہ بیرون ملک، تھوڑے تھوڑے وقفے سے منہ کے بل گر چکا تھا۔ ہر بار مجھے پیٹ اور پسلیوں پر گہری چوٹیں آئی تھیں لیکن میں اٹھ کر دوبارہ کام میں لگ گیا تھا۔ مجھے اپنے کام سے عشق تھا۔ یہ میرا جنون تھا۔ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ چار مرتبہ اس طرح گرنے کی وجہ سے مجھے ہرنیا ہو چکا تھا جس کا جلد از جلد آپریشن ضروری تھا۔ میں آپریشن کو بھی ٹالتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک بار تو ہرنیا کی شدید تکلیف کے دوران ہی میں نے ایک ایوارڈ کی تقریب میں بھی شرکت کی۔

زندگی کا سفر بہت طویل تھا۔ اس میں بڑے نشیب و فراز تھے لیکن اسکرین پر میری فلموں کی جھلکیوں کی صورت میں یہ سفر چند منٹ میں ختم ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرے ذہن میں یادوں کی ایک اور فلم چل پڑی۔ یہ فلم بہت طویل تھی لیکن اس کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے رخساروں پر دو آنسو ڈھلک آئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کیمرا میرے آنسوؤں کو دیکھے۔ میں نے کوشش کی کہ چپکے سے انہیں پونچھ لوں لیکن کیمرا بڑا جاسوس ہوتا ہے۔ وہ انسان کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو بھی اپنی آنکھ میں محفوظ کر لیتا ہے۔

اسٹیج پر میرا نام پکارا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے قریب ہی ایک آدمی آن کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے بڑھاپے اور میری جسمانی حالت اس شخص کو انتظامیہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ مجھے سہارا دے کر اسٹیج پر لے جائے لیکن میں نے نرمی سے اسے منع کر دیا کہ وہ مجھے سہارا نہ دے۔ پھر میں حتی الامکان تیزی سے چلتا ہوا اور پھرتی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اسٹیج پر پہنچا۔ لوگ میرے احترام میں، اور مجھے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بھیگتی محسوس ہوئیں۔ ملک کے صدر نے مجھے ایوارڈ دیا جو ایک میڈل کی صورت میں تھا۔ یہ میڈل مجھے گلے میں پہنایا گیا۔ ہال میں تالیوں کی گونج تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

☆.....☆.....☆

قارئین! کوئی بھی شخص خواہ کتنی ہی غیر معمولی صلاحیتیں لے کر اس دنیا میں آیا ہو، خواہ اس نے کتنی ہی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہو اور کامیابیوں کے کتنے ہی ریکارڈ قائم کئے ہوں، لیکن ایک نہ ایک روز اسے دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔ دیو آنند کی زندگی کے سفر کو انہوں نے خود بھی اختصار سے بیان کیا ہے اور ہم نے اسے مزید مختصر کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دیو آنند ایک مختلف اور منفرد انسان تھے۔ انہوں نے شاندار تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ شاید وہ فطری طور پر بھی جدید سوچ کے مالک تھے، اس لئے فلمی دنیا میں بھی ان کا انداز دوسروں سے ذرا الگ نظر آیا اور ان کی یہ آپ بیتی پڑھتے ہوئے وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ایک مختلف انسان نظر آتے ہیں۔ انہوں نے خاصی بے تکلفی اور دیانتداری سے اپنے نجی معاملات بھی بیان کئے ہیں۔

1946ء سے لے کر اپنی زندگی کے آخری سال، یعنی 2011ء تک انہوں نے جن فلموں میں کام کیا، جو فلمیں بطور ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بنائیں اور جن فلموں کی کہانیاں لکھیں، ان کی مجموعی تعداد 118 ہے۔ ان میں سے بعض فلموں کا شمار آج انڈین فلم انڈسٹری کی یادگار اور کلاسیک فلموں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بلاشبہ برصغیر کی فلم انڈسٹری پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور ان کے تذکرے کے بغیر انڈین فلم انڈسٹری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان کی بہت سی فلموں نے کامیابی کے ریکارڈ بھی قائم کئے اور کچھ فلمیں ناکام بھی رہیں لیکن ناقدین اور باشعور فلمی شائقین نے انہیں بہت سراہا۔

زندگی میں انہوں نے بہت سے اعزازات حاصل کئے جن میں پدم بھوشن، نیشنل فلم ایوارڈ اور دادا صاحب پھالکے جیسے سرکاری ایوارڈ بھی شامل ہیں، جو ان کے ملک کے نہایت اعلیٰ اعزاز ہیں۔ غیر سرکاری سطح پر انہوں نے چار فلم فیئر ایوارڈ حاصل کئے۔ ان کے علاوہ انہیں مختلف اوقات میں ملک کے 26 مختلف ایوارڈز سے نوازا گیا جن میں انڈیا کے نہایت مشہور اخبارات و رسائل اور دیگر اداروں کی جانب سے دیئے جانے والے ایوارڈز شامل ہیں۔ بیرون ملک بھی انہیں مختلف اداروں اور تنظیموں کی طرف سے کم و بیش سات ایوارڈز نہایت تزک و احتشام سے پیش کئے گئے۔

دیو آنند کو یہ کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ انہوں نے بہت سے ایسے نئے چہرے متعارف کرائے جو آج انڈین فلم انڈسٹری کا بہت بڑا نام ہیں یا پھر وہ کامیابیوں کا ایک روشن دور گزار کر آج کہیں اور جا چکے ہیں یا پھر گمنام اور معدوم ہو چکے ہیں۔ ان کے متعارف کرائے ہوئے فلمی ستاروں میں زینت امان، ٹینا منیم، سبرینا (اصلی نام شائستہ) زرینہ وہاب، جیکی شروف، ریچا شرما (سنجے دت کی پہلی بیوی) تبو، انانیہ مکرجی، وغیرہ شامل ہیں۔ وحیدہ رحمان کو پہلی بار ہیروئن کا رول بھی انہوں نے ہی دیا تھا۔

فلم کے دیگر شعبوں میں بھی انہوں نے بہت سے لوگوں کو متعارف کرایا اور بہت سے لوگوں کے کیریئر کو ان کی فلموں کی وجہ سے بڑھاوا ملا ورنہ اس سے پہلے وہ کسی نمایاں کامیابی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ دیو آنند کے ان تمام کاموں، سینیارٹی اور قابلیت کی وجہ سے فلم انڈسٹری میں ان کی بڑی عزت تھی۔ آج کے دور کے مشہور ہیروز شاہ رخ، سلمان اور عامر خان جیسے لوگ ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔

3 دسمبر 2011ء کو فلمی دنیا کا یہ ناقابل فراموش حقیقی کردار زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔ اوپر والے کے لکھے ہوئے اسکرپٹ میں اس کا رول ختم ہو گیا۔ دیو آنند اس وقت اپنے ذہن میں ایک نئی فلم کا منصوبہ لے کر لندن گئے ہوئے تھے اور وہاں کے ''واشنگٹن مے فیئر ہوٹل'' میں مقیم تھے، جب ایک روز وہ اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ ان کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ ''چارج شیٹ'' ان کی آخری فلم تھی جسے ریلیز ہوئے اس وقت چند ماہ ہوئے تھے۔

دیو آنند جب اپنے بھائی وجے آنند کے آخری دنوں میں ان کے پاس اسپتال پہنچے تھے اور انہوں نے وجے کو سخت تکلیف میں دیکھا تھا، پھر جب وہ ان کی آخری رسوم میں شرکت کے وقت ان کی چتا کے قریب کھڑے تھے اور انہوں نے وجے کے مردہ جسم کو دھیرے دھیرے شعلوں کی نذر ہوتے دیکھا تھا تو ان کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔

اس وقت انہوں نے دعا کی تھی کہ جب بھی ان کا آخری وقت آئے تو کوئی ان کے قریب نہ ہو تاکہ کوئی بھی انہیں تکلیف میں مبتلا نہ دیکھے۔ دوسرے کوئی بھی ان کے مردہ جسم کو شعلوں میں جلتے نہ دیکھے۔ غالباً ان کی یہ دونوں دعائیں قبول ہو گئی تھیں کیونکہ ان کے انتقال کے وقت کوئی بھی ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ کسی کو بھی پتا نہیں چل سکا کہ وہ رات کی خاموشی اور تنہائی میں کب اور کس طرح اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اسی طرح کسی نے ان کے مردہ جسم کو شعلوں کا نوالا بنتے نہیں دیکھا کیونکہ آخری رسوم کے بعد ان کے جسد خاکی کو لندن کی ایک برقی بھٹی میں بھجوا دیا گیا تھا جہاں اسے بجلی کی طاقت سے چند منٹ کے اندر اندر جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ یہ راکھ ایک مرتبان میں بند کر کے ان کے آبائی شہر گورداسپور بھجوا دی گئی۔ یوں، زبردست تخلیقی صلاحیتوں کے مالک اور ایک ذہین انسان کی زندگی کا سفر تمام ہوا۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے راکھ، انتہا یہ ہے

(ختم شد)